ڈاکٹر جمیل جالبی

بہادر شاہ ظفر، ایک تحقیدی* مطالعہ

Bahadur Shah Zafar - the last Mughal emperor was also a representative poet of a very significant era in Urdu literature. The present essay encompasses the life and literary contributions of Bahadur Shah Zafar form critical and analytical perspectives.

❖•❖•❖•❖•❖•❖•❖

''خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔'' یہ وہ حقیقی صورت حال تھی جو شاہ عالم کے زمانے سے شروع ہوئی، ان کے بیٹے اکبر شاہ ثانی اور پوتے بہادر شاہ ظفر تک جاری رہی اور پھر، ۱۸۵۷ء کی بغاوت عظیم کے بعد، اس طرح ختم ہوئی کہ نام کا بادشاہ قیدی بنا کر رنگون بھیج دیا گیا، جہاں چند سال بعد بے کسی کی حالت میں وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ جب تک یہ تینوں بادشاہ باری باری سے قلعہ معلیٰ میں مقیم تھے اپنی عظمت رفتہ کے احساس کے ساتھ زندہ تھے۔ انگریزوں کی مسلسل یہ کوشش تھی کہ انہیں قلعہ سے نکال کر نام کی بادشاہی کو بھی ختم کر دیا جائے تاکہ ہندوستان کے اقتدار کلی پر پوری طرح قابض ہو سکیں۔ ان تینوں بادشاہوں کو کمپنی بہادر سے وظیفہ ملتا تھا جس سے وہ اپنے ٹبر کا مشکل سے پیٹ پالتے اور ان روایتوں اور رسوم و رواج کو نبھاتے تھے جو ان کی عظمت رفتہ کی نشانیاں تھیں۔ بہادر شاہ ظفر کے ہاں نہ صرف کارخانہ جات شاہی قائم تھے بلکہ ماہی مراتب، کتب خانہ، نذر نثار، فراش خانہ، سیاہ پلٹن، رسالہ سواران وغیرہ کے ساتھ معززین دربار معلیٰ مثلاً وزراء، استاد، علماء، حکماء، عرض بیگی، کاملین پرفن وغیرہ بھی، تنخواہوں کے ساتھ مختلف منصبوں پر متعین تھے۔(۱) جو انھیں بادشاہ ہونے کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ دربار شاہی کے ادب آداب اسی طرح باقی و جاری تھے اور اسی لیے جب لارڈ ایلن برا ملاقات کے لیے بہادر شاہ ظفر کے دربار میں آئے تو انہیں کرسی پیش نہیں کی گئی کہ ایسا کرنا دربار شاہی کے دستور کے منافی تھا۔ اس پر لارڈ ایلن برا ناراض ہو گیا اور بادشاہ کو اس تخت شاہی پر، جو بہادر شاہ ظفر نے بنوایا تھا اور جس کا نام تخت ہما رکھا گیا تھا، بیٹھنے کی ممانعت

---

* تحقیدی کی اصطلاح ایسے مضامین کے لیے وضع کی گئی ہے جن میں تحقیقی اور تنقیدی دونوں پہلو ہوں۔

کر دی ۔(۲) اس سے پہلے بھی ، نام کے وظیفہ خوار بادشاہ اکبر شاہ ثانی نے ۱۸۱۴ء میں حکومت ہند سے مطالبہ کیا تھا کہ ان کا مرتبہ گورنر جنرل سے زیادہ ہونا چاہیے۔اس سے وہ تضاد نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے جو حقیقی صورت حال اور نفسیاتی صورت حال کے درمیان موجود تھا۔ اب وظیفہ خوار بادشاہ کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس کا سارا وقت ان تہذیبی سرگرمیوں اور رسوم و رواج میں صرف ہوتا تھا جو پابندی کے ساتھ قلعہ معلیٰ میں ادا کی جاتی تھیں۔ قلعہ معلیٰ ان ساری تہذیبی و روایتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ان ساری سرگرمیوں میں شاعری کو اولیت حاصل تھی۔ پہلے حقیقی بادشاہوں کو ملکی امور کے انتظام سے اتنی فرصت کہاں ملتی تھی کہ وہ خود شاعری کریں البتہ سارے فنون لطیفہ کے وہ سرپرست اعلیٰ ضرور تھے۔ ادھر وظیفہ خوار بادشاہوں کے پاس فرصت ہی فرصت تھی اسی لیے وہ خود بھی ان فنون لطیفہ میں حصہ لیتے اور سرپرستی بھی کرتے تھے۔ شاہ عالم ثانی آفتاب شاعر بھی تھی اور خطاط و نثر نگار بھی۔ اکبر شاہ ثانی بھی شاعر تھے اور شعاع تخلص کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر پُرگو شاعر بھی تھے اور خطاط و نثر نگار بھی۔ فنون و ہنر کی سرپرستی کی وجہ سے اہل کمال براہ راست یا بالواسطہ بادشاہ سے وابستہ تھے۔اسی لیے لاکھ سوا لاکھ روپیہ کا وظیفہ کم پڑتا تھا اور اکثر بادشاہ کو نجی جائیداد یا جواہرات گروی رکھ کر اپنا خرچ چلانا پڑتا تھا۔

بہادر شاہ ظفر، جن کا نام ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تھا اور جو اکبر شاہ ثانی کی زندہ اولادوں میں سب سے بڑے بیٹے تھے، ہندو بیوی لال بائی کے بطن سے ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ/۱۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء بروز شنبہ غروب آفتاب کے وقت پیدا ہوئے۔ ''ابوظفر'' ان کا تاریخی نام تھا۔اردو زبان میں ظفر اور بھاکا اور دوسری زبانوں کی شاعری میں'' شوق رنگ'' تخلص کرتے تھے ۔ لال قلعہ ہی میں ان کی تعلیم ہوئی اور یہیں فارسی، عربی زبانوں کو حاصل کیا اور اسی کے ساتھ دوسرے علوم وفنون کا بھی اکتساب کیا۔ اپنے دادا شاہ عالم ثانی کی صحبت میں رہ کر شاعری و خطاطی کا شوق پیدا ہوا اور ظفر نے

مختلف خطوں بالخصوص نسخ اور طغریٰ میں کمال حاصل کیا۔ اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی (۱۲۲۱ھ) کے ساتھ وہ ولی عہد کے منصب پر فائز ہوئے لیکن کچھ عرصے بعد اکبر شاہ ثانی (والد) ان سے ناراض ہو گئے اور مرزا جہانگیر (بھائی) کو ولی عہد بنانے کے لیے انگریز حکام کو لکھا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ۱۸۲۱ء میں جب شہزادہ جہانگیر کا انتقال ہوا تو اکبر شاہ ثانی نے مرزا سلیم کا نام تجویز کیا لیکن گورنر جنرل نے اس نام سے بھی اتفاق نہیں کیا اور بہادر شاہ ظفر بدستور ولی عہد رہے۔ باپ کی ناراضی کے باعث ظفر کا یہ دور بہت سخت گزرا۔ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی وفات پا گئے اور بہادر شاہ ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی کے خطاب کے ساتھ تخت نشین ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۶۲ سال تھی۔ بہت سے شعرا نے تاریخ جلوس کہیں۔ امام بخش صہبائی نے اپنے قطعہ تاریخ میں اس مصرع ''آمد بلب خسرو چراغ دہلی'' کی ترکیب ''چراغ دہلی'' سے سال جلوس ۱۲۵۳ھ نکالا۔ ظفر کا دربار بھی اسی طرح لگتا تھا جس طرح آزاد بادشاہوں کا لگتا تھا۔ ادب آداب کے بھی وہی طریقے رائج تھے۔ اسی طرح مقدمات پیش ہوتے اور ان پر بادشاہ فیصلہ دیتے۔ واضح رہے کہ یہ سب مقدمات قلعہ معلیٰ کی چار دیواری کے اندر ہونے والے معاملات سے متعلق ہوتے تھے۔ دیوان خاص کا رکھ رکھاؤ بھی قدیم بادشاہوں کی روایت کے مطابق تھا۔ ان تمام رسوم و آداب اور قلعہ کی سرگرمیوں کی داستان منشی فیض الدین نے ''بزم آخر'' میں سنائی ہے۔(۳)

جب بادشاہ کے اخراجات اور بڑھ گئے تو انھوں نے وظیفہ بڑھانے کا مطالبہ کیا۔ انگریز تو موقع کی تاک میں تھے۔ انہوں نے اس مطالبے کے جواب میں چند شرائط بادشاہ کے سامنے پیش کیں جن کی تفصیل اسلم پرویز نے سر طامس مٹکاف کی ڈائری سے اخذ کر کے اپنی تصنیف میں درج کی ہیں۔(۴) ان میں سے ایک یہ تھی کہ حضور والا کے شاہزادوں اور بیگمات کے اور تمام تیموری خاندان کے جس قدر دیہات، جاگیریں، باغ،

کنویں اور مکانات وغیرہ ہیں سب انگریزوں کے حوالے کر دیئے جائیں اور ان کے نقشے انگریزی حکومت کو بھیجے جائیں۔ یہ جائیدار ناقابل واپسی ہوگی۔ جن شہزادوں، بیگمات اور اہل خاندان کی تنخواہیں مقرر ہیں وہ شخص جب مرے گا تو اس کی تنخواہ بھی بحق سرکار انگریزی ضبط ہو جائے گی۔ وارثوں کو کچھ نہیں دیا جائے گا۔ ایک شرط یہ تھی کہ شاہ عالم ثانی اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی اولاد کے علاوہ ان سب لوگوں کو قلعہ سے نکال دیا جائے گا جو شاہ عالم ثانی سے پہلے بادشاہوں کی اولاد ہیں اور قلعے میں آباد ہیں۔ ہر مہینے پیدائش و موت کا گوشوارہ انگریزی سرکار کو بھیجنا ہوگا۔ ایک اور شرط یہ تھی کہ بادشاہ کو اپنے خرچ سے قلعے کے اندر انگریزی تعلیم کا ایک اسکول قائم کرنا ہوگا۔ ایک شرط یہ تھی کہ قلعہ کی مرمت اور تنخواہوں کی تقسیم آئندہ ایجنٹ کریں گے۔(۵) بادشاہ نے، جو قرض خواہوں اور بڑھتے اخراجات کے ہاتھوں پریشان تھے، مجبوراً یہ شرائط تسلیم کر لیں۔ وظیفے میں معمولی اضافے کے باوجود مالی تنگی کی صورت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ قلعہ میں قیمتی سامان کی چوریاں بڑھ گئیں اور وقت پر تنخواہیں نہ ملنے کی وجہ سے قلعہ کا نظام بھی بگڑ گیا۔ ایجنٹ کے ذریعے تنخواہوں کی تقسیم نے صورت حال کو مزید خراب کر دیا۔ جہاں سے تنخواہ ملے گی حکم بھی اسی کا چلے گا۔ بادشاہ وقت اور کمزور ہوگیا۔

اس زمانے میں بہادر شاہ ظفر کے بڑے بیٹے مرزا دارا بخت ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء کو وفات پا گئے۔ مرزا دارا بخت کی وفات کے بعد زینت محل نے، جن سے ۱۸۴۰ء میں شاہ ظفر نے ۶۵ سال کی عمر میں شادی کی تھی، اپنے بیٹے جوان بخت (ولادت ۱۸۴۱ء) کو ولی عہد بنانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ یہ وہی جوان بخت ہیں جن کی شادی کے موقع پر غالب اور ذوق نے سہرے لکھے تھے۔ یہ سلسلہ یوں ہی چل رہا تھا کہ انگریزوں نے جون ۱۸۵۲ء میں شہزادے مرزا فخرو سے، بادشاہ کو اعتماد میں لیے بغیر، خفیہ معاہدہ کر کے ولی عہد مقرر کر دیا۔ اس معاہدے کی رو سے بہادر شاہ ظفر کی وفات کے بعد قلعہ معلیٰ کو

خالی کر کے قطب صاحب میں سکونت اختیار کرنی ہوگی۔ اس کے بعد وہ بادشاہ نہیں کہلائیں گے۔ یہ معاہدہ لارڈ ڈلہوزی کی وضع کردہ پالیسی کے مطابق تھا جو چاہتا تھا کہ جیسے جیسے موقع ہاتھ آئے سارے دیسی حکمرانوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا جائے۔ واجد علی شاہ کی معزولی اور خاتمہ شاہی بھی اسی حکمت عملی کا نتیجہ تھی۔ مرزا فخرو نے جب یہ معاہدہ کر لیا تو اس کی بھنک بہادر شاہ ظفر کے کانوں میں پڑی جس کا اظہار انھوں نے کئی اشعار میں بھی کیا ہے۔ اسی زمانے میں بادشاہ بہت بیمار پڑ گئے۔ یہ وہی شدید بیماری تھی جس سے شفایاب ہونے پر غالب اور ذوق نے قصائد کہے تھے۔

اتفاق دیکھیے کہ ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو اچانک مرزا فخرو بھی وفات پا گئے۔ بادشاہ نے ملکہ زینت محل کے دباؤ پر ولی عہدی کے لیے جواں بخت کا نام سب دوسرے شہزادوں کے دستخطوں کے ساتھ، پھر انگریزی حکومت کو بھیجا۔ اسلم پرویز نے نیشنل آرکائیوز دہلی کا وہ خط تلاش کیا ہے جو گورنر جنرل نے شمال مغربی صوبہ جات کے سیکرٹری کے نام لکھا تھا اور جس میں لکھا تھا ''اگر بادشاہ کے خط کا جواب دینا واقعی ضروری ہے تو ان کو مطلع کر دیا جائے کہ گورنر جنرل مرزا جواں بخت کی ولی عہدی کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ ساتھ ہی مرزا قویش بھی اتنے خوش امید نہ ہوں کہ وہ یہ سمجھنے لگیں کہ ان کے ساتھ بھی وہی شرائط عمل میں آئیں گی جو مرزا فخرو کے ساتھ طے پائی تھیں۔ بادشاہ کے زندہ رہنے تک اب کسی قسم کی خط و کتابت حضور والا یا کسی اور شخص سے نہ کی جائے گی۔ نیز یہ کہ اگر بادشاہ کا انتقال ہو جائے یا وہ قریب المرگ ہوں تو فوراً مرزا قویش کو مطلع کیا جائے اور کسی قسم کی سازش یا خوف و ہراس کو پھیلنے نہ دیا جائے لیکن مرزا قویش پر یہ واضح کر دیا جائے کہ گورنمنٹ ان کو محض شاہی خاندان کے سرپرست کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہے اور ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جائے گا جو ان کے بڑے بھائی مرزا فخرو کے ساتھ طے ہوا تھا۔ البتہ بادشاہ کا خطاب اور دوسری شان و شوکت ختم کر دی جائے گی اور (بادشاہ کے بعد) ان کی

حیثیت آل تیمور کے شہزادے کی سی رہے گی۔ جہاں تک وظیفے کا تعلق ہے بادشاہ کے انتقال کے بعد ان کو پندرہ ہزار روپے ماہوار وظیفہ ملا کرے گا۔"(٦) اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انگریزی اقتدار مغل شاہی کو، بہادر شاہ ظفر کے بعد، ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ انگریزوں نے بادشاہ کو اتنا بے بس و لاچار کر دیا تھا کہ اپنے ولی عہد کو مقرر کرنے کا اختیار بھی اب اس کے پاس نہیں رہا تھا۔ ان سب امور کے اثرات معاشرے پر پڑ رہے تھے۔ ادھر بدلے ہوئے معاشی و معاشرتی حالات سے ہر فرد متاثر ہو رہا تھا۔ خود انگریز افسروں کا رویہ بھی دیسی لوگوں کے ساتھ ہتک آمیز تھا۔ ان سب باتوں سے انگریزوں سے نفرت کا لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ علمائے وقت نے انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کی تحریک شروع کر رکھی تھی۔ چپاتیوں کی تقسیم اسی جہادی تحریک کا حصہ تھی۔ سر ٹی جے مٹکاف نے چپاتیوں کی تقسیم کے بارے میں تھانے دار معین الدین حسن، صاحب خدنگ غدر" سے دریافت کیا تو انہوں نے لکھا کہ جب عمل داری مرہٹہ بدلی تو کئی مہینے پہلے اس طرح روٹی اور چنے کا ساگ گانو بہ گانو بٹا تھا اور یہ حقیقت میں نے اپنے باپ سے سنی تھی۔ میرے قیاس میں آتا ہے کہ یہ تقسیم چپاتی بھی شاید علامت کسی فساد کی ہو تو عجب نہیں۔"(٧) مسلمان اور ہندو دونوں انگریزوں کے ذلت آمیز رویے اور معاشی و معاشرتی صورت حال سے پہلے ہی سے ناخوش و ناراض تھے۔ جسٹس میکارتھی نے لکھا ہے کہ "حقیقت یہ تھی کہ برعظیم ہندوستان کے شمالی اور شمال مغرب کے علاقوں میں انگریزی اقتدار کے خلاف دیسی اقوام میں بغاوت کے جذبات موجود تھے۔ یہ محض فوجی بغاوت نہیں تھی۔ یہ بغاوت ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے خلاف، فوجی شکوہ شکایت، قومی تنفر اور مذہبی شدت پسندی کا مرکب تھی۔ اس بغاوت میں دیسی شہزادے اور دیسی سپاہ سب شریک تھے۔ اس بغاوت میں مسلمان اور ہندو، اپنے قدیم مذہبی اختلافات کو بھلا کر، عیسائیوں کے خلاف کمربستہ ہو گئے تھے۔"(٨) ادھر کمپنی بہادر کو صرف و محض اپنے منافع،

درآمدات برآمدات، اجارہ داریوں اور تنخواہوں سے مطلب تھا۔ اتنا بڑا ملک ان کے قبضے میں آ گیا تھا۔ جسے وہ اپنے استعماری و استحصالی رویے سے پوری طرح نچوڑ لینا چاہتے تھے۔ یہاں کے لوگوں کے مسائل و خواہشات کا نہ انہیں اندازہ تھا اور نہ دلچسپی۔ طاقت اور جبر سے لوگوں کو مطیع تو بنایا جاسکتا ہے لیکن ان کو وفادار نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ صورت حال اندر ہی اندر روز بروز خراب تر ہوتی جارہی تھی کہ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے اودھ کی بادشاہ ختم کر دی۔ نفرت، غصے اور انگریز سے نجات حاصل کرنے کا جوش تیزی سے بڑھ اور پھیل رہا تھا۔ انگریز کو ملک بدر کرنے کا مقصد ہر طبقے، ہر فرقے اور ہر مذہب کے لوگوں میں مشترک تھا۔ چربی والے کارتوس کو استعمال نہ کرنے والی حکم عدولی کا واقعہ فروری ۱۸۵۷ء میں بارک والی پلٹن میں پیش آ چکا تھا۔ انگریزوں کو قتل اور ان کے گھروں کو جلانے کے واقعات بھی مختلف شہروں میں ہورہے تھے۔ کانپور والا انگریزوں کے قتل عام کا واقعہ بھی، ابھی تازہ تھا کہ یہی چربی والے کارتوس میرٹھ کی پلٹنوں کے سپاہیوں کو استعمال کرنے کا حکم دیا گیا اور جن سپاہیوں نے انکار کیا ان پر مقدمہ چلا کر لمبی لمبی سزائیں دی گئیں۔ اس پر بغاوت کا بازار گرم ہوگیا۔ سپاہی اپنی بارکوں سے نکل آئے۔ یہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے۔ جیل کی دیواریں گرادی گئیں۔ قیدی آزاد کر دیئے گئے اور پھر یہی لشکر دلی کی طرف چل کھڑا ہوا اور ۱۱ مئی کی صبح دلی پہنچ کر جب پل پار کرنے کی کوشش کی تو بادشاہ کو پتا چلا کہ کوئی لشکر دلی پر چڑھ آیا ہے۔ بادشاہ نے انگریزوں کو اطلاع دی اور لشکر کو سمجھا بجھا کر واپس جانے کی تلقین کی لیکن سپاہیوں کا غم و غصہ اتنا شدید تھا کہ وہ شہر میں گھس گئے اور دلی پر قبضہ کرلیا۔ دلی پر قبضے کے فوراً بعد انہوں نے بادشاہ کو اپنا بادشاہ مان کر قیادت ان کے سپرد کر دی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بادشاہ نے اسے قبول کرلیا۔ اب وہ اس بغاوت کے قائد تھے اور انہوں نے خلوص دل سے اسے چلانے کی کوشش کی۔ ۸۲ سالہ بوڑھا بادشاہ نادار تھا۔ اس میں تنظیمی صلاحیتیں بھی اس درجے کی نہیں تھیں کہ وہ

ان پر جوش باغیوں کو منظم کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لشکر جلد بکھر گیا اور ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے دوبارہ دلی پر قبضہ کر کے وہ قتل عام کیا کہ یہ خونی داستان آج بھی لوگوں کی زبان اور تاریخ کے صفحات پر زندہ ہے۔ باغیوں کی شکست کے بعد بادشاہ نے لال قلعہ چھوڑ دیا اور ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لے لی۔ یہیں سے بہادر شاہ ظفر اہل خاندان کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ خاندان کے بیشتر افراد کو انگریزوں نے پھانسی دے دی۔ بیسیوں شہزادوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور دلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کابلی دروازے سے لے کر قلعہ تک اور دریبہ سے لے کر قلعہ تک اور جامع مسجد سے لے کر دلی دروازہ تک بلاقی بیگم کا کوچہ، خانم کا بازار، خاص بازار، خان دوراں کی حویلی سے دریا گنج تک ہزار ہا مکان منہدم اور مسمار کر کے دلی کا چبوترہ بنا دیا گیا اور چٹیل میدان کر دیا گیا۔''(۹) مرزا غالب نے بھی اپنے خطوط میں اس صورت حال کو بیان کیا ہے۔

جنوری ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلایا گیا اور ۹ مارچ ۱۸۵۸ء کو ان کے خلاف فیصلہ سنا دیا گیا کہ انہیں پھانسی دینے کے بجائے جلاوطن کر کے قید میں رکھا جائے۔ ۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ ظفر ملکہ زینت محل، شہزادہ جواں بخت اور دوسرے افراد کے ساتھ دلی سے روانہ ہوئے اور یہ قیدی الہ آباد اور کلکتہ ہوتے ہوئے ۹ دسمبر ۱۸۵۸ء کو رنگون پہنچے۔ رنگون میں قیدیوں کے ساتھ مناسب سلوک کیا گیا۔ اسلم پرویز نے نیشنل آرکائیوز کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جس میں گورنر جنرل کی یہ ہدایت برما کے گورنر کو بھجوائی گئی ہے کہ'' گورنر جنرل کی ہدایت ہے کہ ان قیدیوں کے ساتھ مہذب طرز عمل روا رکھا جائے۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی بے حرمتی نہ ہو۔ ان تمام باتوں کا بھی خیال رکھا جائے جو ان کے تحفظ کے لیے ضروری ہیں۔''(۱۰) یہاں قیدیوں کو مناسب سہولتیں فراہم کی گئی تھیں لیکن قیدیوں کو قلم دوات اور کاغذ رکھنے کی سختی کے ساتھ ممانعت تھی۔(۱۱) کپتان نیلسن ڈیوس نے جو قیدیوں کا انچارج تھا حکومت

عباس'' دونوں شہزادے انگریزی سیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ لہذا برٹش گورنمنٹ کے لیے یہ نادر موقع ہے کہ انہیں انگریزی سکھائے جس کے ذریعے وہ اپنی تہذیب، اپنی روایات، اپنی زبان اور اپنے لوگوں سے لاشعوری طور پر رشتہ منقطع کرکے ذہنی طور پر انگریزی زبان اور تہذیب کا ایک حصہ بن جائیں گے۔''(۱۲)

رنگون آنے کے بعد سے بہادر شاہ ظفر کی صحت متواتر گر رہی تھی۔ ۳ نومبر ۱۸۶۲ء کو حلق میں فالج کا اثر ہوگیا جس سے کھانے پینے میں تکلیف ہونے لگی اور اسی حالت میں کم و بیش چار سال قید فرنگ میں رہ کر ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو بروز جمعہ صبح پانچ بجے ان کا انتقال ہوگیا اور اسی دن شام کو چار بجے ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کی قبر کو ہموار کر دیا گیا تاکہ کوئی اس کا نشان باقی نہ رہے۔

روشن ترے فروغ سے کیوں کر نہ ہو جہاں
تو ہی ظفر ہے خانہ تیمور کا چراغ

بہادر شاہ ظفر کی یہ بپتا ان کا مقدر تھی اور اسی مقدر کے ساتھ مغلیہ سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

بہادر شاہ ظفر عظمت رفتہ کی آخری نشانی تھے۔ مزاجاً رحم دل، بامروت، غریب پرور، وسیع المشرب اور خلیق تھے۔ نخوت و غرور نام کو نہ تھا:

اے ظفر خاک سے انسان کا بنا ہے پتلا
خاکساری ہی سے دنیا میں ہے انساں کی نمود

یہی عجز و انکسار ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ نماز روزے کے پابند تھے۔ شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ تقویٰ، طہارت و عبادت کی طرف طبیعت مائل تھی۔ اسی لیے غالب نے انہیں ''شاہ دیں دار'' کہا تھا۔ مولانا فخر الدین سے بیعت تھے اور چار ہزار روپے سالانہ ان کو اور ان کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے کو بھجواتے تھے۔ یہ سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا لیکن

زہد وتقویٰ کے ساتھ رقص و موسیقی سے دلچسپی بھی برقرار تھی۔ خود بھی موسیقی پر نظر رکھتے تھے۔ ان کی ٹھمریاں شمالی ہند میں بہت مقبول تھیں۔ منشی فیض الدین نے لکھا ہے کہ "عشاء کا وقت آیا۔ نماز وظیفے سے فارغ ہوئے۔ ناچ گانے کی تیاری ہوئی۔ تان رس خاں چوکی کے طائفے حاضر ہوئے۔ ناچ ہونے لگا۔ ڈیڑھ پہر رات کی توپ چلی۔ دھائیں۔ پھر اسی طرح خاصے کی تیاری ہوئی۔ خاصہ کھایا۔ بھنڈا نوش کیا۔ وہی گھنٹے بھر پیچھے آب حیات مانگا۔ آدھی رات کی نوبت بجنی شروع ہوئی۔ آرام فرمایا۔ چپی، کلی، داستان ہونے لگی۔(۱۳) تقویٰ اور رقص و موسیقی کا یہ تضاد اس لیے تھا کہ یہ بھی عظمت رفتہ کی روایت کا حصہ تھا۔ ایسا ہی ہوتا آیا تھا، اس لیے ایسا ہی ہونا چاہیے اور اسی لیے ایسا ہی ہوتا رہا۔ بہادر شاہ ظفر اسی شاہی روایت کے باعث فن سپاہ گری، تیر اندازی، سپر و شمشیر، شہسواری، فیل سواری وغیرہ پر مہارت رکھتے تھے۔ اسی کے ساتھ بٹیر بازی اور کبوتر بازی سے بھی خوب واقف تھے۔ شاہی اصطبل پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو شاہی گھوڑے ہمدم اور مولا بخش ہاتھی نے دانہ پانی چھوڑ دیا۔(۱۴)

سلسلہ چشتیہ میں بادشاہ کے بہت سے مرید تھے جن کا وہ ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ رعایا کا اتنا خیال تھا کہ جب ریذیڈنٹ نے ایک دفعہ گاؤ قصابوں اور ایک دفعہ گھوسیوں کو شہر سے باہر رہنے کا حکم جاری کیا تو بادشاہ اڑ گئے اور ریذیڈنٹ کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔(۱۵) ظہیر دہلوی نے بادشاہ کی خوش بیانی کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "خوش بیان اس درجہ تھے کہ اگر پہروں بیان فرمائے جائیں تو دل کو سیری نہ حاصل ہو۔ صدہا افسانہ ہائے لطیفہ حکایات عجیبہ وغریبہ نوک زبان تھیں۔"(۱۶) یاد ماضی اور عظمت رفتہ کا احساس ظفر کے انداز فکر کا حصہ تھا اور اسی لیے "یاسیت" ان کے مزاج میں، ان کے لہجے اور بات چیت سے ظاہر ہوتی تھی۔ یہی یاسیت ان کی شاعری کا بھی مزاج ہے۔ یہ وہ یاسیت ہے جو ان کی شخصیت کا جزو بن کر ان کا طرز فکر اور ان کا لہجہ بن گئی تھی جو نہ ذوق

کے ہاں ملتی ہے اور نہ پہلے استاد شاہ نصیر کے ہاں نظر آتی ہے ۔ اس یاسیت میں مغلیہ سلطنت کی کئی سو سال کی تاریخ کا شعور رنگ بھرتا ہے اور اس سے ظفر کی شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی۔

ظفر نام کے بادشاہ ضرور تھے لیکن جب بغاوت کی قیادت انہوں نے سنبھالی تو حکم جاری کیا کہ اس عیدالاضحیٰ کے موقع پر گائے کی قربانی کرنے والے کو موت کی سزا دی جائے گی۔ بادشاہ میں تعصب نام کو نہیں تھا۔

میری ملت ہے محبت میرا مذہب عشق ہے
خواہ ہوں میں کافروں میں خواہ دیں داروں میں ہوں

ہندو مسلمانوں کے بڑے تہوار یکساں جوش و رونق کے ساتھ قلعہ کے اندر مناتے تھے جب کہ انہیں مالی فراغت حاصل نہیں تھی ۔ وہ اسی لیے ہندو مسلمانوں دونوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

بہادر شاہ ظفر اپنے وقت کے بڑے خطاط شمار ہوتے تھے۔ راقم الدولہ ظہیر دہلوی نے لکھا ہے کہ ''خط نسخ میں حضرت بادشاہ ظل اللہ میرے جد بزرگوار میر امام علی شاہ مرحوم کے شاگرد رشید تھے۔ میرے دادا نے میرے والد اور بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کو برابر بتایا تھا۔''(۱۷) حافظ محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ ''دو قطعے انکے بہ خط طغرا میرے کتاب خانے میں موجود ہیں۔''(۱۸) شیفتہ نے لکھا ہے کہ'' در اکثر خطوط دست گاہے شائستہ دارد و بایں فن بسیار مالوف است۔''(۱۹)

ظفر کے ذہن، مذاق سخن اور شخصیت کی تشکیل میں ان کے دادا شاہ عالم ثانی آفتاب کا بھی گہرا اثر تھا۔ شاہ عالم ثانی کی وفات (۱۸۰۶ء) کے وقت ظفر کی عمر ۳۱ سال تھی۔ ان کا پہلا دیوان مرتب ہو چکا تھا۔ اس وقت خود ذوق کی عمر گیارہ سال تھی۔ اسلم پرویز نے لکھا ہے کہ'' دونوں ہندو عورتوں کے بطن سے تھے۔ شاہ عالم ثانی کے ادبی مشاغل

میں تالیف نظم و نثر کے علاوہ خطاطی بھی شامل تھی اور ایسا ہی کچھ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ تھا۔ شاہ عالم ثانی اور بہادر شاہ ظفر دونوں کو گلستان سعدی میں گہری دلچسپی تھی۔ شاہ عالم نے پوری'' گلستان سعدی'' کی کتابت اپنے قلم سے کی تھی اور بہادر شاہ ظفر نے گلستان سعدی کی متصوفانہ شرح فارسی نثر میں لکھی۔ شاہ عالم ثانی کے دو تخلص تھے۔اردو فارسی میں آفتاب اور برج بھاشا میں شاہ عالم۔ بہادر شاہ ظفر کے بھی دو تخلص تھے۔اردو میں ظفر اور بھاشا میں شوق رنگ۔''(۲۰) ان کے علاوہ شاہ عالم ثانی نے دوہرے، سیٹھنے، ٹھمریاں، ہولی، گیت لکھے تھے جن کا مجموعہ'' نادرات شاہی'' کے نام سے مرتب کیا تھااور جنہیں نامور موسیقار مختلف تقریبوں پر گاتے تھے۔ ظفر نے بھی دوہے، ٹھمریاں، پنکھا، ہولی، گیت وغیرہ لکھے جنھیں گویے گاتے تھے۔ دونوں کو موسیقی سے لگاؤ تھا۔

بہادر شاہ ظفر اردو کے علاوہ فارسی، عربی، ہندی، پنجابی زبانوں سے خوب واقف تھے جس کا اندازہ ان کے دواوین سے کیا جا سکتا ہے۔ ان کے پانچ دواوین تھے۔ چار چھپ گئے تھے اور ایک اب ناپید ہے۔ پانچ دواوین موجود ہونے کی تصدیق ظہیر دہلوی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت بادشاہ نے'' کوئی محاورہ زبان کا باقی نہیں چھوڑا۔ پانچ دیوان موجود ہیں۔''(۲۱) ظفر کے چار دواوین مطبع سلطانی سے چھپے۔ پہلا دیوان ۱۲۶۱ھ:/۱۸۴۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں غلطیاں بہت تھیں۔ بادشاہ نے پسند نہیں کیا۔ پھر اس کا ایک اور ایڈیشن، ذوق کی تصحیح کے ساتھ، دیوان حضور والا کے نام سے شائع ہوا۔ دوسرا دیوان ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے کاتب نثار علی نثار تھے جو خود ایک صاحب علم عالی خاندان شخص تھے اور جن کا ذکر'' آثار الصنادید'' کے طبقۂ شعرا میں ملتا ہے۔ اس کے بعد چاروں دیوان ظفر مطبع احمدی امو جان واقع دلہائی ضلع میرٹھ سے ۱۲۷۸ھ میں شائع ہوئے۔ یہ سب مطبع سلطانی سے چھپے ہوئے دواوین کی نقل ہیں۔ انھیں دواوین کی جمع آوری سے مطبع نول کشور لکھنو نے ۱۸۶۹ء میں'' کلیات ظفر'' شائع کیا۔

میرے سامنے جو کلیات ہے اس میں دیوان اول پر سال طبع درج نہیں ہے۔ دوسرے پر سال طبع ۱۸۷۹ء درج ہے۔ دیوان سوم پر بھی سال طبع درج نہیں ہے۔ دیوان چہارم پر پانچویں مرتبہ مئی ۱۹۱۸ء درج ہے اور اس میں جو دو قطعات تاریخ درج ہیں ان سے ۱۸۸۷ء اور ۱۳۰۴ھ برآمد ہوئے ہیں۔ میں نے اسی کلیات ظفر کے ان چاروں دواوین کو اس مطالعہ کے لیے استعمال کیا ہے۔

ان پانچ دواوین کے علاوہ ایک اور تالیف "خیابان تصوف" (۱۲۲۸ھ) ہے جس میں شیخ سعدی کی "گلستان" کی وحدت الوجود اور صوفیانہ انداز نظر سے بزبان فارسی تشریح کی گئی ہے۔ "خیابان تصوف" ولی عہدی کے زمانے کی تالیف ہے۔ اس کی اشاعت ۲ جلوس معلی یعنی ۱۲۵۹ھ مطبع سلطانی سے ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کے ذخیرہ شیرانی میں موجود ہے۔ ان کی ایک کتاب تالیفات ابوظفری (۱۲۲۶ھ) تھی جو تین جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس کا ذکر بہادر شاہ ظفر نے "خیابان تصوف" کے دیباچے میں کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اس تالیف میں لغت و اصطلاحات دکن کو جمع کیا گیا تھا۔ دیوان پنجم کی طرح ۱۸۵۷ء میں "تالیف ابوظفری" بھی دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکی اور اب ناپید ہے۔

صیغہ شاعری بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ابھی قائم تھا۔ پہلے شاہ نصیر اس عہدے پر فائز ہوئے اور جب وہ حیدر آباد دکن چلے گئے تو بقول محمد حسین آزاد کچھ عرصہ کاظم حسین بے قرار سے ظفر مشورہ سخن کرتے رہے اور بقول قدرت اللہ قاسم، ظفران کے بیٹے عزت اللہ عشق سے بھی مشورہ سخن کرتے تھے۔ (۲۲) اس کے بعد شیخ ابراہیم ذوق استاد شہ کے عہدے پر فائز ہوئے اور مرتے دم تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ شاہ نصیر اور ذوق سے استادی کا اعتراف ظفر نے اپنے کئی اشعار میں کیا ہے:

آفریں تجھ کو ظفر ہو کیوں نہ شاگرد نصیر

اس غزل کو جا کے پڑھ ہر ایک دانشور کے پاس
ظفر اگرچہ ہیں شاگرد ذوق یاں لاکھوں
بلند نام ہو تم لیک ان تمام میں ایک

ذوق کی وفات کے بعد مرزا غالب استاد شہ کے منصب پر فائز ہوئے اور ۱۸۵۷ء تک کم، بیش ڈھائی برس اس منصب پر فائز رہے۔

بہادر شاہ ظفر کی شاعری کے مطالعے سے پہلے اس بات کو بھی دیکھ لیا جائے کہ کیا بہادر شاہ ظفر کا کلام ان کے استاد ذوق کا کلام ہے؟ اس بات کو سب سے زیادہ شہرت محمد حسین آزاد نے، استاد ذوق کی وفات (۱۸۵۴ء) کے ۲۷ سال بعد "آب حیات" (پہلا ایڈیشن سال اشاعت ۱۸۸۱ء، دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۳ء) لکھ کر دی اور ایک بے بنیاد بات کو اپنے جادو بیان قلم سے ایسا سنوارا کہ سب اسے حقیقت تسلیم کرنے لگے اور جنھوں نے تسلیم نہیں کیا، وہ بھی شبے میں ضرور مبتلا ہو گئے۔ آزاد نے لکھا:

"بادشاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلے میں کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں۔ کچھ کاظم حسین بے قرار کی ہیں۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ باقی تین سرتاپا حضرت مرحوم کے ہیں۔" (۲۳)

ظہیر دہلوی نے جو ذوق کے شاگرد اور شاہ ظفر سے قریب تھے، بادشاہ کے پانچ دواوین کا ذکر کیا ہے۔ (۲۴) آزاد کی یہ ساری عبارت دیکھیے تو انہوں نے کھیل یہ کھیلا ہے کہ پہلے جملے میں "اصلاحی" کا لفظ نصیر و بے قرار کے تعلق سے استعمال کیا ہے اور آخری جملے سے "اصلاحی" کا لفظ حذف کر دیا ہے تاکہ الجھاؤ باقی رہے اور کسی کے اعتراض پر یہ کہا جا سکے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ذوق کے اصلاحی ہیں ورنہ ظفر کے تین دیوان ذوق سے منسوب ہو جائیں۔

۱۸۵۳ء میں اشپرنگر شاہان اودھ کے کتب خانوں کی وضاحتی فہرست مرتب

کرنے میں مصروف تھے جس میں انھوں نے ذوق کے ذیل میں لکھا ہے "اب کہ ۱۸۵۳ء ہے اور ذوق بقید حیات ہیں اور اس دیوان کے مصنف ہیں جو دلی کے بادشاہ سے، جس کا تخلص ظفر ہے منسوب کیا جاتا ہے۔"(۲۵) یہ رائے اس دور میں ہر اس شخص کی تھی جو انگریزوں کا حامی تھا۔ بادشاہ عوام میں مقبول تھے اور اپنے دل کی بات شعروں میں بیان کر رہے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی غزلیں، ٹھمریاں اور گیتوں کے بول گویوں اور موسیقاروں میں مقبول تھے اور ان کی مقبولیت میں اضافہ کر رہے تھے۔ انگریز اس بات کے اس لیے خلاف تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اہل ہند بادشاہ کے جھنڈے تلے دوبارہ جمع ہو جائیں۔ بادشاہ کی مقبولیت سیاسی طور پر انگریزوں کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ اس خطرے سے نمٹنے کے لیے انھوں نے جہاں بہت سی افواہیں عوام میں پھیلائیں تھیں وہاں یہ بات بھی عام کرنے کی کوشش کی کہ یہ کلام بادشاہ کا نہیں ہے بلکہ یہ سارا کلام ان کے استاد ذوق کا ہے۔ اس بات کو اعتبار کی سند دینے کے لیے ایسے لوگوں کے قلم سے یہ بات پھیلائی گئی جو معتبر تھے۔ ان میں اہل قلعہ بھی شامل تھے اور اشپرنگر اور آزاد جیسے محقق اور صحافی بھی۔ اسپرنگر نے یہ بات ۱۸۵۳ء میں لکھ دی۔ آزاد نے اس کی طرف اپنے "دہلی اردو اخبار" میں ذوق کی وفات پر اپنے مضمون میں اشارہ کیا اور اس سے دو کام لیے۔ ایک یہ کہ استاد ذوق کے دیوان مرتب نہ ہونے کا سبب لوگوں کے سامنے آجائے، دوسرے انگریزوں کی نظر میں خود ان کا درجہ بلند ہو جائے۔ یہی بات انھوں نے جب آب حیات میں لکھی تو اسے طرح طرح سے بیان کر کے اور ہوا دی۔ "بغاوت" کے بعد سے برسوں تک ظفر کا نام لینا اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ نام لیوا بھی بغاوت میں شامل تھا۔ سر سید احمد خاں کے سامنے جب یہ بات چھڑی کہ ظفر کے سب دیوان ذوق کے کہے ہوئے ہیں تو سید صاحب اس پر چیں بہ جبیں ہوئے اور فرمایا کہ " وہ بادشاہ کا کلام تو کیا لکھتا قلعہ کے تعلق سے خود ذوق کو زبان آ گئی۔"(۲۶) یاد رہے کہ آب حیات میں ظفر کو بحیثیت شاعر الگ سے شامل نہیں کیا گیا ہے۔

حافظ محمود شیرانی نے بھی اس بات کو کہ ظفر کا کلام ذوق کا کہا ہوا ہے بالکل بے سروپا اور بے بنیاد بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''ہمارے پاس اس بیان کی تردیدی شہادت موجود نہیں مگر خدا کو آنکھ سے نہیں دیکھا عقل سے تو پہچانا ہے۔ظفر کے ساتھ شاعری کا انتساب اضافی نہیں بلکہ حقیقت امر یہی ہے جس سے ان کے دشمن بھی انکار نہ کر سکے۔(۲۷) اور اس سلسلے میں جو داد تحقیق دی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے (۲۸):

۱۔ مجموعہ نغز (۱۲۲۱ھ) میں قدرت اللہ قاسم نے ترجمہ ظفر میں جو کلام دیا ہے اس میں الف تا یے ردیف غزلوں کا انتخاب شامل ہے ۔ اس انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ظفر کا دیوان مرتب تھا اور مطبوعہ دیوان اول سے زیادہ ضخیم تھا۔ظفر کے اکیاون ابیات سے جو قاسم نے درج کیے ہیں صرف چھبیس ابیات موجودہ دیوان میں مل سکے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظفر (پیدائش ۱۱۸۹ھ) ذوق (پیدائش ۱۲۰۳ھ) کے ہوش سنبھالنے سے پہلے صاحب دیوان بن چکے تھے اور ظفر ذوق سے عمر میں چودہ سال بڑے تھے ۔ دیوان اول کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ظفر اپنا پہلا دیوان ۱۲۱۴ھ میں مکمل کر چکے تھے جس کی تاریخ یوں دی ہے:

یہ دیواں رشک گلشن کیوں نہ ہو گل ہائے مضمون سے
کہ اس کا جو ورق ہے سو خیابان معانی ہے
ظفر یہ بے تامل مصرع تاریخ لکھ اس پر
''مرا اب یک قلم دیوان بستان معانی ہے'' (۱۲۱۴ھ)

اس وقت ذوق کی عمر چودہ سال تھی اور وہ استاد غلام رسول شوق کے شاگرد تھے ۔ اس عمر کا لڑکا ظفر کے دیوان پر کیا اصلاح دے سکتا ہے؟ دیوان کے اسی صفحہ پر ایک اور قطعہ تاریخ ملتا ہے:

ہاتف غیبی سے کل آئی ندا مجھ کو ظفر
فکر میں تاریخ کی رہتا تو کیوں حیران ہے
دو ہیں صدر رشک چمن مصرع یہ مجھ سے ڈھل گیا

''زور اب رنگیں یہ اپنا سر بسر دیوان ہے'' (۱۲۲۳ھ)

ان دونوں تاریخوں میں ۹ سال کا فرق ہے۔ یہ آخری تاریخ دیوان اول کی نظرثانی کی تاریخ مانی جاسکتی ہے جس کا تعلق ذوق سے پیدا نہیں ہوتا۔

۴۔ دیوان چہارم میں ذوق کے متعلق کئی شعر ملتے ہیں:

ظفر اگرچہ ہیں شاگرد ذوق یاں لاکھوں
بلند نام ہو تم لیک ان تمام میں ایک

بعد استاد ذوق تیرے سوا
رکھتا فہمید شعر تر ہے کون

لکھ اسی قافیے میں اور غزل
تجھ سے بہتر اب اے ظفر ہے کون

تیرا مذاق شعر ظفر جانتا ہے کون
استاد ذوق تھا ترے واقف مذاق سے

بے ذوق ذرا لطف نہیں شعر و سخن میں
اس رمز نہانی کو کوئی پوچھے ظفر سے

ترے سخن میں ہے استاد ذوق کا وہ فیض
غزل لکھی نہ کسی نے ظفر برابر کی

یہ سب حوالے ذوق کی وفات کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ الغرض دیوان چہارم کے وقت استاد ذوق زندہ نہ تھے۔ معلوم ہوا کہ ظفر کا دیوان اول و چہارم ذوق سے قبل اور بعد کی پیداوار ہے۔ دیوان چہارم میں مرزا غالب کی اصلاح کا پرتو بعض غزلیات میں نظر آتا ہے۔

۳۔ شاعر کا کلام اس کے جذبات، خیالات و معتقدات، انداز و عادت، خوبو وضع

قطع، پسند و ناپسند کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی شاگرد و استاد کی شخصیتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ظفر کی شخصیت ذوق سے بالکل مختلف اور نمایاں ہے۔ اگر کلیات ظفر تمام تر ذوق کی شاعری کا مرہون احسان ہے تو اس میں وہی انداز اور رنگ و طرز ادا موجود ہونے چاہیں جو ذوق کے کلام کے ساتھ مخصوص ہیں لیکن دونوں کا رنگ جدا جدا ہے۔ ذوق کی غزلیات عام طور پر لمبی ہوتی ہیں۔ ان میں کئی کئی مطلعوں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں ظفر کی غزلیں مختصر ہوتی ہیں۔ عام طور پر ایک مطلع پر قناعت کی جاتی ہے۔ طرحیں نرالی اور انوکھی ہیں۔ نئی زمین بھی خود نکالتے ہیں:

دل اپنا فکر غزل میں نہیں لگتا
زمیں غزل کی نہ ہووے اگر انوکھی سی

ہر غزل کی اپنی ہے ٹیڑھی زمینِ سنگلاخ
ہم کو بھاتی ہی نہیں ہے اے ظفر سیدھی طرح

باندھے نئے مضامیں چن کر ظفر سب اس میں
تجویز جس غزل کی ہم نے زمیں نئی کی

شاعرانہ تعلّی اور شعرا پر چوٹیں بھی کی ہیں۔ میر سے داد کے خواستگار ہیں۔ ناسخ و آتش سے اپنی استادی منواتے ہیں۔ جرات و مہجور کی گردن ان کے سامنے جھکتی ہے:

زمانے میں جو کہلاتے ہیں شاعر آج کل اچھے
ظفر رتبہ ملا ان کو ترے فیضِ سخن سے ہے

یہ غزل پڑھیے اگر بزم سخن داں میں ظفر
کیوں کہ تحسیں کے لیے پھر نہ سر میر ہلے

اے ظفر ایک ہے تو فنِ سخن میں استاد
کیوں نہ قائل ہوں ترے ناسخ و آتش دونوں

تبدیل قوافی سے غزل لکھ ظفر ایسی

تا جس سے جھکے جرات و مہجور کی گردن

۴۔ کئی موقعوں پر اپنی خوش نویسی کا ذکر کیا ہے اور اپنے شاگردوں پر ناز کرتے ہیں۔ ظفر خط نسخ میں استاد مانے جاتے تھے:

ہوں لاکھ خوش نویس اگر خط نسخ میں
پر ہو کسی کا خوب نہ خط سے ظفر کے خط
خوش نویس ایسا ہے تو دیکھ کے ہوتے ہیں خجل
تیرے خامے کی ظفر صاحب فرہنگ تراش

۵۔ اپنی بادشاہی کی طرف بہت کم اشارے کیے ہیں:

کیا ہمیں حشمت شاہی سے محبت ہووے
اے ظفر ہم تو فقیروں سے ہیں الفت رکھتے
نہ کیوں شاہنشہی اپنی جہاں میں فخر شاہاں ہو
کہ فیض دو جہاں مجھ کو ہوا یہ فخر دیں سے ہے
روشن ترے فروغ سے کیوں کر نہ ہو چراغ
تو ہی ظفر ہے خانہ تیمور کا چراغ

۶۔ مولانا فخر الدین فخر جہاں کے مرید تھے۔ چاروں دواوین میں بے شمار تلمیحیں ملتی ہیں۔ ان کے فرزند قطب الدین اور ان کے فرزند نصیر الدین (کالے خان صاحب) کا بھی ادب سے ذکر کرتے ہیں۔ مشائخ میں شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ معین الدین چشتی اور بوعلی قلندر سے خاص عقیدت رکھتے ہیں:

خاک پائے فخر دیں ہے اپنے حق میں کیمیا
اے ظفر کیوں خواہش اکسیر کرنی چاہیے
ظفر کی چاہیے نصرت تمہیں نصیر الدین

کہ اس کے یارو مددگار ہاں تمھی تو ہو

ہے جو خواجہ کی زیارت کا تصور اے ظفر

آ بسے گویا مرے اجمیر آنکھوں کے تلے

خود کو ظفر اصحاب اربع کی خاک پا کہتے ہیں۔ حب آل رسول و اصحاب رسول
نجات ہے۔ پنج تن کی خاک پا بننا ان کا دین و ایمان ہے:

ابوبکر و عمر، عثمان و حیدر کا ہے کیا کہنا

ظفر ہم خاکِ پا ان چار یار مصطفیٰ کے ہیں

چار یاروں سے نبی کے ہے عداوت جس کو

سر پہ ہم مارتے ہیں اس کے ظفر لاتیں چار

مان اے ظفر تو پنج تن و چار یار کو

ہیں صدر دیں کی یہی محفل کے چار پانچ

وہ مسلماں ہیں ظفر صاحب ایماں کہ جنھیں

نہ صحابہ سے ہو بغض اور نہ شبیر سے لاگ

بعض واقعات عصری اور دیگر امور کی طرف اشارے کرتے ہیں:

اعتبار صبر و طاقت خاک رکھوں اے ظفر

فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

جو آ گیا ہے اس محلِ تیرہ رنگ میں

قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

لڑتی ہے بندوق سے جو اے ظفر فوج فرنگ

رکھتا ہے ہتھیار پاس اپنے تلنگا آگ کا

حلقہائے موئے پیچاں سے بنا کر پھانسیاں

اس فرنگی زادہ نے کتنے ہی عاشق گل دیے

زلف پر پیچ کے اس بت نے جو پھندے مارے

دے کے پھانسی کئی اللہ کے بندے مارے

نہیں تار سرشک سرمہ آلود اس کی مژگاں میں

کمر باندھے یہ کالی پلٹن استادہ ہے میداں میں (۲۹)

۷۔ ظفر نے نظم کے میدان میں بہت سی ایجادیں کی ہیں مثلاً صنعت ردالعجز علی الصدر، صنعت عکس کی طرز کی ایک صفت ہے جس میں پہلے مصرع کی تقدیم و تاخیر سے دوسرا مصرع بنتا ہے۔ یہ دونوں غزلیں جن کے مطلع درج ذیل ہیں اسی صنعت میں کہی گئی ہیں:

آیا سحاب ساقی تو لا شراب ساقی

تو لا شراب ساقی، آیا سحاب ساقی

یہی ایک غم ہے، یہی اک الم ہے

یہی اک الم ہے، یہی ایک غم ہے

۸۔ پنجابی زبان کے ساتھ ظفر کا انس ان کے کئی مثلثوں سے عیاں ہے جن میں پنجابی دوہروں کو اردو مصرعوں کے ساتھ ترکیب دیا ہے۔ بعض غزلوں میں بھی پنجابی زبان استعمال ہوئی ہے۔

۹۔ آزاد نے لکھا ہے کہ "استاد جب حضور کی غزل مشاعرے کے لیے کہتے تھے تو اپنی غزل اس طرح میں نہ کہتے تھے اور کبھی کہنی بھی پڑتی تو اپنی غزل کے ایسے شعر پڑھتے کہ حضور کی غزل پھیکی نہ پڑ جائے۔" شیرانی نے لکھا ہے کہ اللہ اللہ! استاد ذوق کو اپنے شاگرد ظفر کی خاطر داشت کس قدر منظور تھی کہ لحاظ کے مارے اپنی غزل کے بہتر اشعار مشاعروں میں پڑھنے سے احتراز کرتے تھے لیکن مولانا کے دعوے کے مطابق شاہی غزل

بھی تو استاد ہی کو تیار کرنی پڑتی تھی۔ اس سے یہ منطقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ذوق اپنے
اچھے ابیات اپنے لیے محفوظ رکھتے اور خراب اور بھرتی کے اشعار حضور کی غزل کے واسطے
چھوڑ دیتے۔ جائے حیرت ہے کہ مولانا آزاد نے یہ راز از خود طشت از بام کردیا۔ مصحفی
جیسا کہ ''آب حیات'' میں مذکور ہے بہترین اشعار اپنے سالے کو لینے دیتے اور کوئی
چرچانہ کرتے۔ ادھر ذوق ہیں کہ روکھے پھیکے اور بے لطف اشعار ظفر کے حوالے کرتے
ہیں اور اس طرح ذلیل قسم کے احسان کا ذکر اپنے شاگردوں سے کرتے ہیں۔ ان کو
پروانہیں کہ بادشاہ بدنام ہوتے ہیں۔ وہی بادشاہ جس نے انھیں خاک سے پاک کیا۔ پانچ
سے سو تک تنخواہ دی۔ گاؤں جاگیر میں دیا۔ انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ خلعت و
خطاب سے سربلند کیا۔ استاد شاہی کا منصب بخشا۔ ہم چشموں میں سرفراز کیا۔ ایسے بادشاہ
والا جاہ کے ساتھ ذوق کا یہ رسوا کن سلوک لائق نفرت بلکہ موجب عبرت ہے۔''(۳۰)

۱۰۔ آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''کئی مخمس تھے۔ کئی رباعیاں تھیں، صدہا تاریخیں
تھیں۔ تاریخوں کی کمائی بادشاہ کے حصے میں آئی کیوں کہ بہت بلکہ کل تاریخیں انہیں کی
فرمائش سے ہوئیں اور انہیں کے نام سے ہوئی ہیں۔'' شیرانی نے لکھا ہے کہ ''ظفر کے
چاروں دیوان موجود ہیں۔ اس میں سوائے پہلے دیوان کی دو تاریخوں کے جن کا ذوق سے
کوئی علاقہ نہیں، کوئی تاریخ موجود نہیں۔ آخر یہ بڑا ذخیرہ جو ذوق نے ظفر کو بخشا تھا، کہاں
گیا۔''(۳۱)

ان سب دلائل وحقائق کے پیش نظر اور ظفر کے کلام کے مزاج اور انداز بیان کو
سامنے رکھتے ہوئے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آزاد نے اپنے استاد
کو نادانی میں ذلیل کرایا ہے اور ظفر کی عوامی مقبولیت کو کم کرنے میں حکومت وقت کی جو مہم
تھی اس کا ساتھ دیا ہے۔ حقائق کے سامنے آنے کے بعد اب یہ بات ہی بے معنی ہو گئی
ہے کہ کلیات ظفر کو ذوق سے منسوب کیا جائے۔ یہ دونوں اپنے اپنے مزاج کے مختلف

شاعر ہیں۔ یہ سارا کلام ظفر کا ہے جس پر شاہ نصیر کی طرح ذوق نے بھی بحیثیت استاد شہ اصلاحیں دی ہیں۔ وفات ذوق کے بعد اصلاح کا یہ کام مرزا غالب نے بھی کیا لیکن نہ اپنے کسی شاگرد سے اس بارے میں کچھ کہا اور اپنے کسی خط میں کوئی ایسا دعویٰ کیا کہ وہ غزلیں کہہ کر ظفر کو دیتے ہیں۔ استاد شہ کے عہدے پر کسی شاعر کا تقرر قلعہ کی شاہی روایت کا حصہ تھا، جہاں اور دوسرے فنون کے استاد شاہی ملازمت میں تھے وہاں فن شاعری کا استاد بھی موجود تھا جس کا کام بادشاہ اور شہزادوں کے کلام کو بنانا اور جشن جلوس، عید، بقرعید، شادی بیاہ کے موقع پر قصیدہ پیش کرنا تھا۔ ظفر اگر از روئے روایت ذوق کو غزلیں دکھاتے تھے تو یہ ایک معمول کی بات تھی جس سے خود استاد کی عزت و شہرت میں اضافہ ہوا تھا۔ وہ ملک الشعرا کہلائے۔ جاگیر سے نوازے گئے۔ خاقانی ہند کے خطاب سے سرفراز ہوئے ۔ اگر آتش مصحفی کے شاگرد تھے یا داغ ذوق کے شاگرد تھے یا اقبال داغ کے شاگرد تھے تو اس کے یہ معنی تو ہرگز نہیں ہیں کہ مصحفی یا ذوق نے آتش یا داغ کو غزلیں کہہ کر دی تھیں۔ یہی صورت ذوق و ظفر کی تھی ۔ استاد جو اصلاح دیتا تھا وہ زبان و بیان اور فنی سقم کی حد تک ہوتی تھی۔ یہی کام ذوق نے ظفر کے کلام کے ساتھ کیا۔ خود ظفر نے کہا ہے:

اے ظفر اپنی ریاضت کا نہ جب تک بل ہو
نہ تو بل پیر کا کام آئے ، نہ استاد کا بل

خود ذوق ظفر سے گہری عقیدت رکھتے تھے ۔ ان کے بڑے وفادار تھے ۔ ساری عمر ان کا در چھوڑ کر نہیں گئے اور یہیں وفات پائی۔ ظفر نے ذوق کی وفات پر جس طرح اظہار غم کیا اس سے خود ظفر کی محبت کا اظہار ہوتا ہے جس پر ہم ذوق کے مطالعے میں لکھ آئے ہیں۔

ظفر دن رات شعر گوئی میں مصروف رہتے تھے۔ ''مجموعہ نغز'' میں جو ان کی ولی عہدی کے زمانے میں مکمل ہوا، قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ ''ایں فن شریف بسیار در

سردارند و اکثرے از اوقات ہمایوں بہ سخن سازی و نکتہ پردازی ہمت می گمارند ......‘‘(۳۲)
اپنی زود و پرگوئی کا اظہار ایک شعر میں بھی کیا ہے:

لکھ ڈالے ظفر دفتر اشعار کے اک دم میں
ہاتھوں میں ذرا اپنے جس وقت قلم پکڑے

ان باتوں کے علاوہ ظفر و ذوق کی شاعری کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ان دونوں شاعروں کی آوازوں میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ آواز اور اس کا لہجہ ہر شخص کی پہچان ہوتا ہے۔ ٹیلی فون پر صرف آواز اور اس کے لہجے ہی سے آپ آدمی کو پہچان لیتے ہیں۔ ذوق کی آواز جو ان کی شاعری پڑھتے ہوئے سنائی دیتی ہے گونج دار آواز ہے۔ اس میں ایک بھاری پن ہے۔ایسا بھاری پن جو ڈھول کی آواز میں ہوتا ہے۔ اس میں بلند آہنگی ہے، ایک جوش سا ہے جو قصیدے کے لے نہایت موزوں آواز ہے۔ ذوق جب اسی آواز کو غزل میں سموتے ہیں تو لفظوں کی بندش سے پیدا ہونے والا زور اور بناؤ سنوار سے وہی آواز ذرا دھیمی ہو کر ان کی غزلوں میں در آتی ہے۔ظفر کی آواز نرم اور مہین ہے۔ یہ آواز ظفر کی شخصیت سے مناسبت رکھتی ہے۔ وہ یاسیت، وہ غم انگیزی جو پوری تہذیب کے مزاج پر چھائی ہوئی ہے۔ظفر کی آواز میں نمایاں و شامل ہے۔ یہ آواز ذوق کی آواز سے الگ اور مختلف ہے۔ یہ آواز جب کھلتی ہے تو سوز کا سا لہجہ پیدا ہوتا ہے جو دل پر اثر کرتا ہے۔ اس آواز میں ظفر کا جذبہ اور مٹتی تہذیب کا غم شامل ہے۔ ذوق کی شاعری، ناسخ کے ’’طرز جدید‘‘ کی طرح جذبے سے خالی ہے۔ اس آواز میں ہلکا سا کھرا پن ہے۔ اس میں وہ مٹھاس، وہ گھلاوٹ نہیں ہے جو ظفر کے منتخب اشعار میں محسوس ہوتی ہے اور دل پر اثر کرتی ہے۔ظفر کی آواز میں اس قید کا احساس بھی شامل ہے جسے وہ لال قلعہ کی چار دیواری میں قدم قدم پر محسوس کرتے ہیں اور اس چوٹ کی کسک بھی جو ’’کمپنی بہادر‘‘ کے احکامات سے پیدا ہونے والے احساس ذلت سے ابھرتی ہے۔ ان کی آواز میں تہذیب کا زوال،

ویرانگی، ٹوٹ پھوٹ، بے کسی، آنے والے دور کے خدشات اور بے چارگی بھی شامل ہے۔ ذوق نیچے سے اوپر اٹھتے تھے ۔ وہ دربان یا سپاہی کے بیٹے تھے۔ ان کے لیے ملک الشعرا، خاقانی ہند، خان بہادر وغیرہ خطابات اور استاد شہ کے منصب پر فائز ہونا ان کی زندگی کا قابل رشک عروج تھا۔ وہ فرش سے عرش پر پہنچے تھے۔ظفر تیمور کی اولاد تھے۔ بادشاہ ابن بادشاہ ابن بادشاہ تھے۔ وہ عرش سے فرش پر آئے تھے ظفر کو زندگی کی بڑھتی ہوئی تاریکی اپنے آغوش میں لے رہی تھی ۔ یہ زوال ، یہ گرنا کوئی معمولی گرنا نہیں تھا۔ یہ ذات کے ساتھ پورے نظام، پوری تہذیب کا گرنا تھا۔ یہ سب کچھ مل کر ان کی آواز میں یاسیت اور غم زدگی کو جنم دیتے ہیں۔ اس طرح ذوق کی شاعری ان کی اپنی شخصیت اور ظفر کی شاعری ان کی اپنی شخصیت کا اظہار کرتی ہے ۔یہی ان دونوں کی شاعری کے مزاج کا فرق ہے۔ ایسے میں کوئی آنکھوں کا اندھا ہی کلام ظفر کو کلام ذوق کہہ سکتا ہے۔ ظفر جو بحر --- چھوٹی یا بڑی، اپنے مزاج کے اظہار کے لیے چنتے ہیں ان کی اسی آواز سے مناسبت رکھتی ہے ۔ظفر کے لیے شاعری خود کو زندہ رکھنے اور پہاڑ جیسے غموں کا مقابلہ کرنے کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ان کا تزکیہ نفس (Catharsis) ہوتا ہے:

نہ رہا یار، نہ غم خوار، نہ مونس نہ رفیق
مگر اک غم نے دیا عاشق غمگین کا ساتھ

ہمیشہ کنجِ تنہائی میں مونس ہم سمجھتے ہیں
الم کو یاس کو حسرت کو بیتابی کو حرماں کو

خوب گزری گرچہ اوروں کی نشاط و عیش میں
اپنی بھی رنج و الم کے ساتھ اچھی نبھ گئی

ان کے منتخب کلام میں یہی آواز سنائی دیتی ہے:

وہ کارواں کہ جو منزل پہ اپنی جا پہنچا

اسی کے پیچھے رواں صورت غبار ہوں میں

جز غم و رنج و درد و یاس و تعب

ہم نے دنیا میں آ کے کیا پایا

ٹھکانا جب نہ رہا کوئے یار میں اپنا

تو اے ظفر یہ بتا ہم کو ہم کہاں کے رہے

بارے گر پڑ کے قافلے والو

اب (تو) یہ بھی غریب آ پہنچا

اسی تخلیقی عمل سے ذوق و ظفر کی شاعری کا فرق پیدا ہوتا ہے۔ ظفر کی غزلوں میں ان کے عصر نے، خود ان پر گزرنے والے واردات و واقعات نے ایسا اثر پیدا کیا ہے جس سے ان کی شاعری عوام میں بھی بہت مقبول ہوئی۔ دراصل ان کے لیے شاعری ہی وہ ذریعہ تھی جس سے وہ اپنے دل کی بات اپنی رعایا تک پہنچا سکتے تھے اور یہی کام انھوں نے کیا۔ فراق گورکھپوری نے لکھا ہے کہ ''اردو شاعری کی تاریخ اور روایتوں میں جو فائدے استادوں نے شاگردوں سے اٹھائے ہیں وہ ہمیشہ صیغہ راز میں رہے ہیں اور ظفر کوئی معمولی شاگرد نہیں تھا۔ وہ ذوق کی شاعری اور شاعرانہ ذہنیت کی فضا بن گیا تھا۔''(۳۳) ذوق کی خارجیت میں جو ذرا سی داخلیت نظر آتی ہے، وہ خود شاگرد ظفر کا اثر ہے ورنہ ذوق کا کلام جذبے کی شاعری سے مزاجاً عاری ہے۔ وہ اردو پن جو ذوق کی نمایاں خصوصیت ہے۔ دراصل ظفر اور اس تہذیب سے آیا ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ شاگرد ظفر استاد و ذوق سے کم و بیش چودہ سال بڑے تھے اور جب ذوق نوعمر تھے۔ ظفر اپنا پہلا دیوان مرتب کر چکے تھے۔

یہ دور اردو شاعری کا بڑا اہم دور تھا۔ ظفر کی ولی عہدی کے زمانے میں بھی متعدد شعرا کے لکھنو و حیدر آباد چلے جانے کے باوجود نامور شاعر دلی میں موجود تھے جن میں ثنا اللہ فراق، شاہ نصیر، حافظ عبدالرحمٰن احسان، قدرت اللہ قاسم، میر قمر الدین منت،

نظام الدین ممنون وغیرہ شامل تھے اور ظفر کی بادشاہی کے زمانے میں غالب، ذوق، مومن، شیفتہ، تسکین، صہبائی، آزاد اور دوسرے شعرا دادِ سخن دے کر اردو شاعری کے وجود کو منور کر رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر، خود شاعر ہونے کے ساتھ شاعروں اور شاعری کے سرپرست تھے اور ان کے مزاج و پسند کے اثر کی پھوار سب پر پڑ رہی تھی۔ ظفر نے کسی خاص رنگ سخن کی پیروی نہیں کی۔ شاہ نصیر نے نئی نئی سنگلاخ زمینوں میں شاعری کو رواج دیا اور اس میں ایسا کمال دکھایا کہ یہ اپنے وقت کا مقبول ترین رنگ بن گیا۔ ظفر نے اس رنگ میں بھی شاعری کی اور خود بہت سی نئی زمینیں ایجاد کیں اور زبان و بیان میں محاورے کے استعمال سے وہ کام کیا جو خود شاہ نصیر سے بھی نہ ہوسکا۔ تصوف ان کے مزاج اور حالات کا تقاضا تھا۔ یہ بھی ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ ظفر نے اپنے قلبی واردات کو شاعری میں بیان کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا ہے۔ یہ ان کا خاص رنگ ہے جو ان کے دونوں استادوں یعنی شاہ نصیر اور ذوق کے رنگ سے لگا نہیں کھاتا۔ پھر جس زبان میں ظفر نے شاعری کے یہ مختلف پہلو بیان کیے ہیں۔ وہ زبان ظفر کا امتیاز اور ان کی انفرادیت ہے۔ آیئے اب ایک ایک کر کے ان پہلوؤں کو لیتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر کی آواز میں یاسیت اسی طرح شامل ہے جس طرح پھول میں خوشبو ہوتی ہے۔ اس یاسیت میں ان کی ذاتی زندگی کے دکھ درد کی لے شامل ہے۔ ولی عہدی کا زمانہ اس کرب میں گزرا کہ والد محترم اکبر شاہ ثانی ان سے اتنے ناراض تھے کہ دوسرے شہزادوں میں سے ایک کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ ظفر نے اس دکھ کو تحمل کے ساتھ برداشت کیا۔ پھر مغلیہ سلطنت جس طرح تیزی کے ساتھ تباہی اور خاتمے کی طرف جا رہی تھی اس نے ان کے مزاج میں سوز و گداز کو پیدا کیا۔ یہی سامنے کے واقعات و حالات ان کی زندگی کے مشاہدات و تجربات تھے جنھیں ظفر نے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ ان کی شاعری کا یہ حصہ، غزل کے رموز و کنایات میں، اپنے تجربات و مشاہدات

کو، خلوص وصداقت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اسی لیے دل پر اثر کرتا ہے:

اے ظفر یہ تیرے اشعار ہیں یا نالۂ زار
کیا بلا ہیں کہ جو یوں ہیں دل میں اثر کرتے ہیں

یہ پُر اثر حصہ شاعری دراصل ان کی آپ بیتی ہے ۔ قلعے کے مخبر، انگریزی حکومت کو، اس شاعری کی خبر مسلسل دے رہے تھے۔ انگریز بادشاہت کو ختم کرنا چاہتے تھے اور یہ مقبولیت ان کے راستے میں روڑے اٹکا رہی تھی۔ اس مقبولیت کو کم سے کم کرنے کے لیے وہ طرح طرح کے جتن کر رہے تھے۔ اس پہلو کو بار بار وہ اپنی شاعری میں طرح طرح سے بیان کرتے ہیں:

ہم چمن میں کر رہے ہیں آشیاں اپنا درست
کرتا ہے صیاد فکر دام و تدبیر قفس
ہر روز ستم تازہ ہے ہر روز نیا ظلم
اے شوخ ستم گر تیری ایجاد کو شاباش
جو دوست تھے وہ ہیں دشمن عجب تماشا ہے
ہوا ہے دیکھو زمانہ کا حال کیسا کچھ
ہیں ظفر گرچہ گہر بار ہمیشہ بادل
ایک خوں بار مری طرح کوئی ہو تو سکے
یہ مریض عشق جاں بر ہو چکا
اے طبیب اس کی دوا کرتا ہے کیا
آزاد کب کرے، ہمیں صیاد دیکھیے
رہتی ہے آنکھ باب قفس پر لگی ہوئی

ظفر کی شاعری کا خاصا بڑا حصہ انھیں تجربات و مشاہدات کا اظہار ہے۔ اس میں قفس، صیاد،

زندان، زنجیر، آشیاں، گلُ عندلیب، شمع گل گیر، ویرانہ، آنسو، نالہ، قاتل، تیغ، نمک، زخم، تصویر خیالی، آگ، اجڑا دیار، بھڑکتے چراغ کی لو، خنجر قاتل، بھنور میں چراغ جیسے کنائے ان کے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

دل میں تو کچھ نہیں ہے دم و دود اے ظفر
اک آہ رہ گئی ہے فقط اک جگر کے پاس
شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوز نہاں جلتی ہے

ان دونوں شعروں کو دیکھیے۔ پہلے شعر میں جذبہ پوری طرح تجربے میں شامل نہیں ہوسکا اس لیے اس میں وہ اثر پیدا نہیں ہوتا جو دوسرے شعر میں محسوس ہوتا ہے۔ یہاں تجربہ اور جذبہ مل کر ایک ہوجاتے ہیں اور سوز نہاں کی تصویر دل میں اتر جاتی ہے۔ لفظوں کی بندش اور زبان کی قدرت نے اس تجربے کو اس شعر میں پوری طرح اتار دیا ہے۔

ظفر کی ساری زندگی ایک المیہ تھی جس کا اظہار ان کی شاعری کے اس حصے میں ہوتا ہے۔ اس میں صرف محبوب کے بچھڑ جانے کا غم نہیں ہے بلکہ پوری سلطنت کے بکھر جانے کا غم شامل ہے۔ ایسا غم جس میں غم عشق، غم روزگار اور زندگی کے دوسرے چھوٹے بڑے غم گرد کارواں کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس کرب سے ظفر کا وہ مخصوص لحن پیدا ہوتا ہے جس میں ایک جلنے سلگنے والی کیفیت اور ایک ایسی آگ ہے جو اس کے وجود کو پھونکے ڈالتی ہے:

آتش عشق سے اڑ جائیں سمندر کے حواس
یہ ہمیں ہیں کہ جو اس آگ میں گھر کرتے ہیں
عین گریہ میں مرے سینہ و دل ہیں سوزاں
دیکھ اس شدت باراں میں یہ گھر جلتے ہیں
نہ ہوئی گریہ سے کم کچھ بھی تری گرمی دل

بلکہ اک آگ سی اے دیدہ تر اور لگی

لے دل کو نکال آہ کوئی چیر کے پہلو

شاید مجھے آرام ظفر ہووے تو یوں ہو

آہ کب سینے سے اے ہم نفساں نکلے ہے

دل میں اک آگ سلگتی ہے دھواں نکلے ہے

ظفر کا یہی وہ کرب ہے جو ان کی شاعری میں آگ کی طرح سلگتا رہتا ہے لیکن اس کرب کے بیان سے تزکیہ نفس نہیں ہوتا بلکہ شعر پڑھ کر اضطراب بڑھ جاتا ہے۔ ظفر کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اپنی حالت سے دوسروں کو باخبر کر دے اور اس طرح کر دے کہ "صیاد" کو خبر نہ ہو۔ بادشاہ ظفر کو اس بات کا احساس تھا کہ لوگ اب بھی ان کے وفادار ہیں۔ جاں نثار اب بھی موجود ہیں اور شاید یہی جاں نثار اس کرب کی داستان سن کر اسے صیاد سے نجات دلا سکیں۔ یہی خواہش اس کرب میں شامل ہے۔ یہ چند شعر دیکھیے کہ ظفر کس سوز و گداز سے اپنا پیغام دوسروں تک، رعایا اور عوام تک پہنچا رہے ہیں اور کس طرح سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور تقسیم چپاتی و لال کنول کی حمایت کر رہے ہیں۔ ظفر کی شاعری میں ان کا عصر بھی موجود ہے اور ان کی ذات بھی:

کشتۂ قامت جتنے ہیں اس کے آپس میں سب مل جل کر

کر دیں اگر اک حشر بپا کیا اچھا ہو کیا اچھا ہو

قفس کے ٹکڑے اڑا دوں تڑپ تڑپ کے آج

ارادہ میرا اسیران ہم نفس یوں ہے

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو

میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

پڑا جو خانۂ زنداں میں غل خدا جانے

کہ میرے پاؤں کی زنجیر ہل گئی تھی کیوں

توڑ زنجیر کو دیوانہ نہ بھاگا ہوں کہیں

دیکھیو غل ہے پڑا خانہ زندان میں کیا

بہار آئی اسیران ہم نفس آپس میں کہتے ہیں

پھڑک کر توڑنا ہے گر قفس تیار ہو جاؤ

قفس میں ہے کیا فائدہ شور و غل سے

اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

ہمدمو مثل صورت تصویر

کیا کہیں تم سے بے صدا ہیں ہم

جواس کی جان پر گزرے ہے وہی جانے ہے

خدا کسی کو جہاں میں کسی کے بس نہ کرے

اے بلبلو اتنا نہ کرو غل کہ مبادا

دشمن ہو سوا جان کا صیاد تمہاری

ظفر نے اردو شاعری کی روایتی علامتوں سے کام لے کر اپنے دکھ درد، صیاد کے رویے، اپنی آرزوئں، احتجاج اور رہائی کا اس طرح بیان کیا ہے کہ شاعری جذبے کے ساتھ مل کر پر تاثیر ہو جاتی ہے اور قفس کی روئیداد بلبلوں تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ظفر کی شاعری کا سماجی پہلو ہے:

ظفر شعر وسخن سے راز دل کیوں کر نہ ہو ظاہر

کہ یہ مضمون سارے دل کے اندر سے نکلتے ہیں

یہی دل کی آواز ان کی شاعری ہے جس میں وہ اپنے روز مرہ کے تجربات و مشاہدات کو روز مرہ کی کی زبان میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری خیال کی سطح پر "ذاتی" ہے۔

اس حصہ شاعری میں ظفر امکان کے کئی سرے ابھارتے ہیں لیکن انہیں پوری

طرح اپنے تصرف میں نہیں لا پاتے۔ میر، غالب، آتش اور مومن کے مقابلے میں ظفر کی تخلیقی شخصیت چھوٹی تھی ورنہ اس کرب کی لے میں ایک نئے غم کی صورت اختیار کرنے کا امکان موجود تھا۔ یہ غم میر کے غم سے مختلف غم ہے۔

میں اپنے سوز دل کو بجھاؤں تو کس طرح
اب تو نہیں ہے بوند بھی آنسو کی آنکھ میں

یہی وہ شاعری ہے جو آج ظفر کی پہچان ہے اور یہی وہ شاعری ہے جو اس لیے بھی مقبول عام ہے کہ اسے پڑھ کر یا سن کر ہم مغلیہ تہذیب کے خاتمے کی داستان غم تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وہ غم تھا جو اس دور کے ہندوستانی سماج کا غم تھا اور آج ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ ظفر کی شاعری کی آواز تاریخ کی اسی آواز کی یاد دلاتی ہے۔ اس طرح ظفر کی یہ دل گداختگی، یہ سوز، یہ غم تمام قوم کے غم کا ترجمان بن جاتا ہے۔ یہ یاسیت یا غم زدگی ایسی ہے جو اس سے پہلے کی اردو شاعری میں نہیں ملتی اور یہی قابل توجہ اور خاص بات ہے۔ یاد رہے کہ یہ یاسیت، یہ غم ہر شاعر کے غم سے مختلف ضرور ہے لیکن اس غم کا مقابلہ میر کے غم سے نہیں کیا جا سکتا۔ غم کا وہ رچاؤ اور وہ آفاقیت جو میر کے ہاں ملتی ہے اور جس کی بناء پر غم بھی فن کا اعلیٰ حصہ بن کر تزکیہ (Catharsis) بن جاتا ہے، ظفر کے اس غم میں شامل نہیں ہے۔ یہ ذاتی غم ہے، آفاقیت کے روپ میں نہیں ڈھلتا۔ ظفر کی شاعری ہمیں متاثر تو کرتی ہے کہ یہ "تاریخ" کی آواز ہے لیکن تسکین کا سامان مہیا نہیں کرتی۔ وہ ہمیں مضطرب تو کرتی ہے لیکن اس کا اثر، فن کی سطح پر، ذاتی ہونے کے سبب، دبی دبی سی سنسنی خیزی کا سا رہتا ہے۔ ظفر اپنے دور کے اہم شاعر اور گرتی تہذیب کی تاریخی آواز ہونے کے باوجود میر، غالب، آتش وغیرہ کے دائرے سے باہر رہتے ہیں۔ ظفر کی افسردگی طبعی ہے اور یہ افسردگی زوال پذیر ماحول کا عام رجحان ہے:

کتنے ہی بن کے شہر کے اور گانو کے نشاں
یوں مٹ گئے زمیں سے کہ جوں پانو کے نشاں

اور اس مٹنے کو وہ صبر و تحمل سے برداشت کرتے ہیں اور اسے تقدیر سے منسوب کرتے ہیں۔ تقدیر اٹل ہے۔ یہی ظفر کا عقیدہ ہے جسے بار بار وہ اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں لیکن اس میں بھی یاسیت کی لے شامل ہے:

بلا سے گرچہ ہوتا رازِ دل افشا ہے رونے میں
نہ روکو مجھ کو رونے سے مزا آتا ہے رونے میں

نہ بدخواہوں سے کچھ ہوگا نہ ہوگا خیر خواہوں سے
جو کچھ تقدیر کی اپنی ہی گردش ہونے والی ہے

نے خرد نے ہوش نے تدبیر پر شاکر ہیں ہم
دوستو اپنی فقط تقدیر پر شاکر ہیں ہم

جو کہ منظور اسے ہے وہی ہووے گا ظفر
کیا کروں میں کہ مرے ہاتھ تو کچھ ہے ہی نہیں

ناحق میں ملے دوست رقیبوں میں ہمارے
ہووے گا وہی جو ہے نصیبوں میں ہمارے

ظفر کی شاعری جیسا کہ میں نے کہا، ان کی آپ بیتی ہے۔ اس کے مطالعے سے ان کی زندگی اور رویوں کا کھوج لگایا جاسکتا ہے ۔ان کی شاعری سے ان کی شخصیت کی تصویر اتاری جاسکتی ہے۔ یہ شاعری اپنے عصر سے جڑی ہوئی ہے اور سیاسی، معاشی و معاشرتی حالات کے جو اثرات، بادشاہ ہونے کے ناتے ان پر پڑتے ہیں، وہ غزل کے کنایات و رمزیات میں اسے بیان کر دیتے ہیں۔ یہی ان کی شاعری کا مزاج اور رنگ ہے ۔ وہ جاگیر دارانہ نظام کے بلند ترین نمائندہ ہونے کے باعث خود اٹھ کر پانی بھی نہیں پی سکتے کہ اس سے رتبے میں فرق آتا ہے ۔اسی طرح شاعری کے ذریعے اپنے دل کی بات کہہ دینا ہی ان کے لیے کافی تھا اور اسی لیے وہ فن پر، میر و غالب کی طرح محنت نہیں کرتے

جس کا فن شعر تقاضا کرتا ہے۔ وہ تو بس اپنی بات قلعہ معلّی کی زبان میں بیان کرنے
اکتفا کرتے ہیں۔ شعر کو مانجھنا، بنانا سنوارنا، بادشاہ کا کام نہیں تھا اور ظفر بہرحال بادشاہ
تھے۔ وہ طویل بحروں کا انتخاب بھی اس لیے کرتے ہیں کہ ان میں بات، تشریح کے ساتھ
جلد بیان ہوجاتی ہے لیکن اس کلام کا بھی اپنامعیار، اپنالہجہ، اپنا لحن ہے اور ان کے
ہم عصروں سے مختلف ہے۔ اس کلام کا رنگ و مزاج ان کا اپنا ہے۔ وہ باتیں جو مشاہدے
میں آتی ہیں، وہ جذبہ جو دل میں پیدا ہوتا ہے اور وہ واردات جو دل پر گزرتے ہیں ا
انھیں صاف سیدھے بول چال کی بامحاورہ زبان میں بیان کر دیتے ہیں۔ ظفر فطری
شاعر ہیں لیکن فکر و فن کی سطح پر وہ درجہ اعتماد کو نہیں پہنچ پاتے۔ یہی ان کا طرز سخن ہے:

طرز سخن کا اپنے ظفر بادشاہ ہے
اس کے سخن سے یاں نہ کسی کا سخن لگا

جیسا کہ کہا یاسیت، اداسی و افسردگی ان کی ساری زندگی پر چھائی ہوئی ہے۔ یہ اس تہذیب
کے دور آخر کی تاریخ کی آواز کا لحن ہے اور اسی لحن سے ظفر کی شاعری کا لحن تشکیل پاتا
ہے۔ اسی یاسیت کے زیر اثر دنیا کی بے ثباتی اور فنا کا احساس انہیں تصوف کی طرف لے
جاتا ہے جہاں زندگی کے طوفان میں وہ خود کو سائبان عافیت کے تلے محسوس کرتے ہیں اور
اسی لیے پہاڑ جیسے غم ظفر کی شخصیت کو ڈھاتے نہیں بلکہ سہارا دیتے ہیں۔ اسی سے استغنا،
صبر و شکر، توکل و قناعت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور تصوف ان کی زندگی میں داخل
ہوجاتا ہے اور ان کے ایمان کو پختہ تر کرکے ان کا انداز نظر بن جاتا ہے۔ تکبر و غرور کے
بجائے عجز و انکسار ان کے مزاج کا حصہ بن جاتے ہیں اور بڑے سے بڑے غم کو
اٹھانےکا حوصلہ اور زندگی سے پیار پیدا ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی فقیری بھی ان کے مزاج میں
در آتی ہے۔ ظفر سلسلہ چشتیہ میں حضرت فخر الدین سے بیعت تھے:

مرشد پاک رواں فخر الدین

قبلہ و کعبہ جاں فخر الدین

ظفر کے ہاں تصوف میں میر درد کی طرح گہرائی نہیں ہے اور نہ غالب کی طرح وہ مسائل تصوف پر کسی نئے زاویے سے روشنی ڈالتے ہیں وہ تو ''اپنے قلب کے تاثرات اور احساسات کو سیدھے اور سادے الفاظ میں پیش کر دیتے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد مفہوم کو سمجھنے کے لیے غور وفکر کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی بلکہ...... اس کے اثرات خود بخود دل پر قائم ہو جاتے ہیں ...... وہ ہمہ اوست کے قائل ہیں اور مئے وحدت کے خمار میں ان کو عالم ناسوت کی تمام چیزیں عالم لاہوت میں نظر آتی ہیں۔''(۳۴) ان کی شاعری کا خاصا بڑا حصہ صوفیانہ خیالات اور صوفیانہ انداز نظر کا اظہار کرتا ہے لیکن یہاں بھی کوئی گہرائی نہیں ہے۔ ان کی ایک بھی غزل میں رنگ تصوف کی وہ چاشنی نظر نہیں آتی جو مثلاً سراج اورنگ آبادی کی غزلوں میں نمایاں و موثر ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ روحانیت کے اس درجے پر نہیں پہنچ سکے جہاں اسرار و رموز کے پردے اٹھنے لگتے ہیں اور منزل وصل سامنے آنے لگتی ہے۔ ایک دور ایسا بھی آیا کہ لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے اور ان کے مرید ہو گئے ''گلستان سعدی'' کی صوفیانہ شرح وہ اپنے مریدوں کے سامنے بیان کرتے تھے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ تصوف نے ان کے مزاج میں انکسار، فقر و درویشی پیدا کر کے زندگی کو ان کے لیے آسان بنا دیا تھا۔ کلیات ظفر میں سینکڑوں اشعار بلکہ غزلیں کی غزلیں صوفیانہ خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔ تصوف ان کی زندگی میں ان کے اپنے حالات کے راستے سے داخل ہوا اور ان کی زندگی کا جزو بن گیا۔ اس کے ساتھ ناصحانہ و اخلاقی اشعار کثرت سے ان کی شاعری کا حصہ بن گئے جن میں سے بہت سے ضرب المثل بن گئے ہیں:

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا

جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

جو کہ ہو تجھ سے سوا تو اسے حسرت سے نہ دیکھ

اور جو تجھ سے ہو کم اس کو حقارت سے نہ دیکھ

ایک بات جو ظفر کے ہر رنگ شاعری میں یکساں طور سے پائی جاتی ہے وہ ان کا طرز ادا اور سادہ و صاف بامحاورہ زبان کا استعمال ہے، جس پر انھیں ایسی قدرت حاصل ہے کہ وہ اپنے ہر تجربے اور مشاہدے کو آسانی سے بیان کر دیتے ہیں۔ سنگلاخ زمینوں میں بھی اسی قدرت زبان کی وجہ سے وہ ہر زمین کو پانی کر دیتے ہیں۔ سنگلاخ زمینوں کے تو ان کے پہلے استاد شاہ نصیر موجد تھے لیکن ان کے بعد یہ کام ظفر نے اپنے استاد سے زیادہ کیا اور متعدد نئی زمینیں خود ایجاد کیں۔ ظفر کی ان زمینوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں عام طور پر ردیفیں اردو ہیں اور قافیے بھی عام طور پر اردو ہیں۔ مثلاً یہ چند زمینیں دیکھیے:

بلا سے جاہ و حشم ہو تو ہو نہ ہو تو نہ ہو

نہیں ہے ہم کو بھی غم ہو تو ہو نہ ہو تو نہ ہو

اس مشکل ردیف میں بھی ظفر نے صاف غزل نکالی ہے۔ وہ مسجع غزل دیکھے جس کا ایک شعر یہ ہے اور جس میں ''یہ کس کے ہوئے اور کس کے ہوں گے'' ردیف ہے اور پوری غزل میں صفائی و سادگی بھی بدرجہ اتم موجود ہے اور ردیف اپنی جگہ لطف دے رہی ہے:

قول و قسم سب ان کے غلط ہیں ، اپنی غرض کے یار فقط ہیں

جانتے ہیں خوب ان کو ہم ، یہ کس کے ہوئے اور کس کے ہوں گے

انتہائی مشکل زمینوں کے یہ چند مطلع دیکھیے۔ ظفر کا کمال یہ ہے کہ وہ ان زمینوں میں بھی دلچسپ بامعنی اور صاف شعر نکال کر اپنی قادر الکلامی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں:

چلے کہاں ہم سے روٹھ کر تم اٹھائے تم نے قدم چھپا چھپ

نہ جانے دیں گے لپٹ کے بوسے تمہارے لے لیں گے ہم چھپا چھپ

کیا رنگ دکھاتی ہے یہ چشم تر اوہو ہو

خون جگر آہاہا ، لخت جگر اوہو ہو

نہ ہم خوش ، نے خفا دل سے کوئی یوں ہو تو یوں بھی ہو
غرض کیا کام کیا دل سے کوئی یوں ہو تو یوں بھی ہو

ظفر کو شعر کہنے میں اس وقت زیادہ لطف آتا ہے جب زمین انوکھی اور نرالی ہو اور کمال کی بات یہ ہے کہ زبان بامحاورہ اور صفائی و سادگی بھی اسی طرح برقرار رہتی ہے۔شاہ نصیر سنگلاخ زمینوں کی وجہ سے محاوروں کو شعر کا جامہ نہ پہنا سکے جس طرح ظفر نے اپنے کلام میں، مشکل زمینوں کے باوجود، محاورات استعمال کیے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اردوئے معلیٰ میں ،جس کا مرکز قلعہ معلیٰ تھا اور جہاں کی زبان سب کے لیے سند تھی، محاورات کثرت سے بول چال کی زبان کا حصہ تھے ۔اگر کلام ظفر سے محاورات جمع کیے جائیں تو سینکڑوں کی تعداد میں ہاتھ آئیں گے ۔

ظفر بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔اسی لیے ان کے ہاں اردو پن نمایاں رہتا ہے ۔اسی اردو پن کی وجہ سے ان کے ہاں پے چیدہ فارسی تراکیب نظر نہیں آتیں۔ ان کے ہاں خالص اردو، اپنے محاوروں کے بانکپن کے ساتھ، شاعری میں ابھرتی ہے اور ایسی سادگی و صفائی کو جنم دیتی ہے جو ظفر کی انفرادیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعر براہ راست عام قاری تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ ان کی شاعری کی تاثیر زبان کے اس استعمال سے پیدا ہوئی ہے جس میں محاورہ لطف سخن میں روح پھونکتا ہے ۔انھیں لفظوں کے مختلف لہجوں میں چھپے ہوئے معنی کو بیان کرنے کا ایسا شعور ہے کہ دوسروں کے ہاں کم کم نظر آتا ہے۔ ہر ردیف کے ساتھ جتنے ممکن محاورے باندھے جاسکتے ہیں وہ سلیقے سے اس طرح باندھتے ہیں کہ زبان و بیان کا مزہ دوچند ہو جاتا ہے مثلاً یہ غزل دیکھیے جس کا مطلع یہ ہے:

زیر خنجر ترے بسمل جو یہ دم توڑتے ہیں
کوچہ غم میں پھر آنے کی قسم توڑتے ہیں

اس میں ''توڑتے ہیں'' ردیف ہے ۔ مصدر توڑنا سے جتنے ممکن محاورات غزل میں آسکتے تھے وہ سب ظفر نے باندھ دیے ہیں مثلاً دم توڑنا، قسم توڑنا، قدم توڑنا، توبہ توڑنا وغیرہ۔

اسی طرح ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

دل پر بلائے زلف گرہ گیر ڈال دی
تو نے مصیبت اے مری تقدیر ڈال دی

اسمیں ''ڈال دی'' ردیف ہے اور مصدر ڈالنا سے بلا ڈال دینا، زنجیر ڈال دینا، مصیبت ڈال دینا، گردن ڈال دینا، جوانی ڈال دینا، آگ ڈال دینا، تاثیر ڈال دینا، وغیرہ محاورات صفائی و سادگی سے باندھ دیے ہیں۔ظفر لفظوں کے معانی کے مختلف روپ اس سلیقے سے باندھتے ہیں کہ ہر شعر ایک معنی کو روشن کرتا ہے۔ ظفر کی نو شعروں پر مشتمل ایک غزل ہے جس کی ردیف ''تڑاق پڑاق'' ہے اور گفتگو، دوبدو، سبو وغیرہ قافیے ہیں۔اس غزل کا مطلع یہ ہے:

نہ کیجئے ہم سے بہت گفتگو تڑاق پڑاق
وگرنہ ہووے گی پھر دوبدو تڑاق پڑاق

اس غزل کے ہر شعر کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے تو تڑاق پڑاق کے مختلف معنی روشن ہوتے جائیں گے اور اندازہ ہوگا کہ اردو زبان میں بول چال کی زبان کے استعمال سے کتنی توانائی پیدا ہوتی ہے اور خود ظفر کو لفظوں اور محاوروں کے محل استعمال پر کتنی قدرت حاصل تھی۔ ظفر کی نظر بول چال کے قرینوں پر زیادہ رہتی ہے ۔ وہ اپنے کلام میں گفتار کا مزہ پیدا کرنے کے لیے بندھے ٹکے محاوروں کے علاوہ دوسرے تیوروں کو بھی کام میں لاتے ہیں جن میں سے بعض انھی سے مخصوص ہیں۔ظفر کی فصاحت میں ان کا انفرادی رنگ اس قدر گہرا اور نمایاں ہے کہ ادا شناس نظریں ان کی ہر غزل کو دور سے پہچان سکتی ہیں۔ ان کے سامنے نہ ان کے بعد کوئی اس رنگ کا لکھنے والا نہیں ہوا۔''(۳۵) ظفر نے اس طرح زبان اور لغت کی

جو خدمت انجام دی ہے اور الفاظ و محاورات کے مختلف معانی کو شعر کا جامہ پہنا کر جس طرح محفوظ کر دیا ہے یہ ایسی خدمت ہے جو تاریخ ساز ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ ''شاعر کا بنیادی کام تو اتنا ہے کہ وہ اپنی زبان کو محفوظ رکھے، اسے وسعت دے اور آگے بڑھائے۔''(۳۶) اور یہ کام ظفر نے بڑے سنجم، بڑے سلیقے سے انجام دیا ہے۔ اس کام میں ظفر کا بہت دل لگتا ہے:

دل اپنا فکر سخن میں ظفر نہیں لگتا
زمیں غزل کی نہ ہو جب تلک انوکھی سی

زمینِ سہل میں تو ہیں سبھی کچھ شعر کہہ لیتے
ظفر لکھتے غزل جو ایسی مشکل ہیں تو آپ ہی ہیں

ظفر کی شاعری میں ترنم بھی زبان پر قدرت اور موسیقی کے شوق سے پیدا ہوا ہے جو یاسیت کے رنگ سے مل کر پراثر لحن میں ڈھل جاتا ہے۔ موسیقانہ جھنکار ان کے کلام کی عام خصوصیت ہے۔ ان کے ہاں صنائع بدائع کا استعمال بھی ہے اور تشبیہات سے حسن ادا کو موثر بنانے کا سلیقہ بھی ۔سہل ممتنع میں بھی متعدد اشعار ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ ظفر، میر و غالب کی طرح کے ،بڑے شاعر تو نہیں ہیں لیکن وہ معمولی شاعر بھی نہیں ہیں۔ ان کی زبان میں اردو پن، شعری مزاج میں ہندوستانیت، لہجے میں جوگیا پن، طرز ادا میں شگفتگی اور انداز بیان میں ایسا مزہ ہے جو ظفر کا امتیاز ہے:

ترا سخن وہ مزے دار ہے کہ حشر تلک
رہیں گے اس کے ظفر طبع نکتہ داں پہ مزے

ظفر نے غزل کے ساتھ ساتھ مختلف اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے جس میں مثلث ،مخمس ،مسدس، قطعہ، سلام، پنکھا، سہرا، دوہے اور ٹھمریاں، تضمین در زبان پنجابی کے علاوہ ایک نعتیہ قصیدہ بھی ہے جو دیوان اول کے شروع میں، حمد کے بعد، شامل ہے اور

جسکا مطلع یہ ہے:

اے سرور دو کون شہنشاہ ذوالکرم
سرخیل مرسلین وشفاعت گر امم

جذبۂ عقیدت اور سرشاری عشق کے لحاظ سے ایک پر اثر قصیدہ ہے ۔ اس میں ایسا ترنم اور ایسا لحن ہے کہ یہ نعتیہ قصیدہ دل میں اتر جاتا ہے ۔ان کا کلام ان کے زمانے میں بھی قوال، گویے اور طوائفیں گاتی تھیں اور آج بھی ان کا کلام گویوں کی زبان پر ہے ۔منشی کریم الدین نے بھی یہی لکھا ہے کہ ''تمام ہندوستان کے اکثر قوال اور رنڈیاں ان کی غزلیں، گیت اور ٹھمریاں گاتے ہیں۔''(۳۷) ظفر کے کلام کے ایک کڑے انتخاب کی ضرورت ہے تا کہ آنے والی نسلیں دلچسپی سے ان کے کلام کا مطالعہ کر سکیں۔ آج حسرت موہانی کا انتخاب بھی تبرک کا درجہ رکھتا ہے۔''(۳۸)

اس دور میں شاہ نصیر، ابراہیم ذوق اور بہادرشاہ ظفر وہ شاعر ہیں جنہوں نے اردو زبان کو ایک ایسا روپ دیا،اردو پن جس کی بنیادی خصوصیت ہے۔ ان کے ہاں فارسی طرز ادا کی وہ روایت، جس میں فارسی و عربی الفاظ کے ساتھ پیچیدہ فارسی تراکیب کااستعمال کثرت سے ہوتا ہے، دم توڑ دیتی ہے اور خالص اردو زبان جس میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب، اعتدال و توازن کے ساتھ، زبان کا حصہ ہیں، پورے جماؤ کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ زبان کے اس روپ کا رشتہ بول چال کی زبان ،اس کے مختلف لہجوں اور تیوروں سے قائم ہوجاتا ہے اور وہ ایک نئے حسن کے ساتھ انیسویں صدی کے سماج کی عام زبان بن جاتی ہے۔ زبان و بیان کے تعلق سے ان تینوں شاعروں کی خدمات لازوال ہیں لیکن ظفر وہ شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری سے اسے مکمل کر دیا۔ عام بول چال کی زبان سے رشتہ جوڑنے کا کام شروع تو شاہ نصیر نے کیا تھا لیکن اس میں تاثیر کا رنگ اور جذبے کو شامل کر کے اسے جو صورت دی وہ عوام و خواص دونوں کے لیے

شاہ نصیر کی شاعری جذبے سے عاری ہے۔ ذوق کی شاعری میں بھی خارجیت چھائی ہوئی ہے لیکن ظفر کی شاعری میں جس طرح دبا دبا سا جذبہ رنگ گھولتا ہے اور جس طرح عام بول چال کی زبان اپنے لہجوں اور تیوروں کا اظہار کرتی ہے، ظفر اپنے دونوں استادوں سے آگے ہیں البتہ فن شاعری کی سطح پر وہ ذوق اور شاہ نصیر دونوں سے پیچھے ہیں۔ نواب مرزا داغ دہلوی، ذوق اور بہادر شاہ ظفر کے رنگ سخن اور زبان ہی سے اپنا چراغ شاعری روشن کرتے ہیں۔ داغ دہلوی کی زبانِ سخن میں ذوق وظفر دونوں کی آوازیں شامل ہیں:

سخن دان وسخن گو، یوں تو دنیا میں ہزاروں ہیں
ظفر پر ہم نے تیری سی سخن گوئی نہیں دیکھی

ظفر کی شاعری کی زبان میں متروکات بہت کم ہیں جو زبان انھوں نے استعمال کی ہے وہ ان کے زمانے میں مستند تھی اور خود ظفر سند کا درجہ رکھتے تھے۔ تلک، واں، یاں، ووں، ہووے، آوے وغیرہ کے علاوہ ان کی زبان بنیادی طور پر وہی ہے جو آج ہم بولتے ہیں۔

❖•❖•❖ ❖•❖•❖ ❖•❖•❖

حوالہ جات

۱۔ داستان غدر، ظہیر دہلوی، ص ۱۵، مطبع کریمی لاہور (سن ندارد)

۲۔ قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں، عرش تیموری، ص ۳۲، مکتبہ جہاں نما، دہلی، ۱۹۳۷ء

۳۔ بزم آخر، منشی فیض الدین، مرتبہ ولی اشرف صبوحی دہلوی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۵ء

۴۔ بہادر شاہ ظفر، اسلم پرویز، ص ۵۶۔۵۸، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، ۱۹۸۶ء

۵۔ ایضاً اور طامس مٹکاف کی ڈائری، ترجمہ ضیاء الدین برنی، مرتبہ حسن نظامی، ص ۹۱۔۹۲ حلقہ مشائخ، دہلی

۶۔ F.D Political No 189, N.A I بحوالہ بہادر شاہ ظفر، اسلم پرویز، ص۹۹۔۱۰۰، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلی، ۱۹۸۶ء

۷۔ خدنگ غدر، معین الدین حسن، مقدمہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ص۲۱، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۹۷۲ء

۸۔ A Short History of our own times, Justive Mc Carthy, p170, London 1883

۹۔ داستان غدر، راقم الدولہ ظہیر دہلوی، ص ۳۷، مطبع کریمی لاہور، سن ندارد

۱۰۔ بہادر شاہ ظفر، اسلم پرویز، ص ۱۳۹، انجمن ترقی اردو ہند دلی ۱۹۸۶ء بحوالہ ایف ڈی پولیٹیکل نمبر ۵۲۔۱۲۵، مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۸ء

۱۱۔ ایضاً ص ۱۴۴

۱۲۔ ایضاً بحوالہ نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی پولیٹکل نمبر ۱۲۴

۱۳۔ بزم آخر، منشی فیض الدین دہلوی مرحوم، مرتبہ ولی اشرف صبوحی، ص۱۹، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء

۱۴۔ داستان غدر، ظہیر دہلوی، ص ۲۴۔۲۶، مطبع کریمی لاہور، سن ندارد

۱۵۔ ایضاً ص ۳۶۔۳۷

۱۶۔ ایضاً ص ۲۶

۱۷۔ داستان غدر، محولہ بالا، ص۱۹

۱۸۔ مقالات شیرانی، حافظ محمود شیرانی، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، جلد سوم، ص۱۵۱، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۹۔ گلشن بے خار، مصطفیٰ خان شیفتہ، ص ۱۲۹، مطبع نول کشور، لکھنو ۱۸

۲۰۔ بہادر شاہ ظفر، اسلم پرویز، ص۳۴۴، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، ۱۹۸۶ء

۲۱۔ داستان غدر،ص۲۰،محولہ بالا
۲۲۔ مجموعہ نغز،قدرت اللہ قاسم، جلد اول، مرتبہ محمود شیرانی، ص ۳۷۳، پنجاب یونیورسٹی لاہور،۱۹۳۳ء
۲۳۔ آب حیات،محمد حسین آزاد، بار دہم،ص۴۹۰۔۴۹۱ ،آزاد بک ڈپو،مطبع کریمی لاہور
۲۴۔ داستان غدر،محولہ بالا،ص۲۰
۲۵۔ A Catalogue of the Arabic, Persian, Hindustany Manuscripts of the libraries of the king of ovdh, A sprenger, p 222, Calcutta 1854
۲۶۔ چند ہم عصر،عبدالحق،ص
۲۷۔ مقالات حافظ محمود شیرانی، مرتبہ مظفر محمود شیرانی، جلد سوم، ص۱۴۳۔۱۴۴، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۹ء
۲۸۔ ایضاً ص ۱۴۱۔۱۶۲
۲۹۔ مجاہدین کی فوج سیاہ لباس میں ملبوس رہتی تھی۔
۳۰۔ مقالات شیرانی، جلد سوم، ص ۱۴۱۔۱۶۲،محولہ بالا
۳۱۔ ایضاً،ص۱۴۱۔۱۴۲
۳۲۔ مجموعہ نغز،قدرت اللہ قاسم، مرتبہ محمود شیرانی، جلداول، ص ۳۷۳، پنجاب یونیورسٹی،لاہور،۱۹۳۳ء
۳۳۔ اندازے،فراق گورکھپوری،ص۹۴، ادارہ فروغ اردو،لاہور، ۱۹۵۶ء
۳۴۔ بہادر شاہ ظفر،سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص۱۹۰۔۱۹۱، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، ستمبر۱۹۳۸ء
۳۵۔ انتخاب ذوق ظفر، شان الحق حقی،ص ۱۸۱، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۴۵ء

۳۶۔ تنقید اور تجربہ، جمیل جالبی (مضمون بہادر شاہ ظفر)، ص ۱۸۰، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۸ء

۳۷۔ طبقات الشعرائے ہند، کریم الدین وفیلن، ص ۴۳۴، دہلی ۱۸۴۸

۳۸۔ انتخاب سخن، حسرت موہانی، جلد اول، سلسلہ شاہ حاتم، ص ۲۷۲۔۲۹۱، احمد المطابع کانپور، ۱۹۲۵ء

Scanned by CamScanner